رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۲۰ — نمبر ۴

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۱ء

تصاویر:- ۱- فونتینبلو کا محل ——— کتب خانہ
۲- علامہ اقبال

جہاں نما

اسلام اور مسائلِ حاضرہ پر ڈاکٹر اقبال کا تبصرہ

راونڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے حال ہی میں سر محمد اقبال جب بمبئی سے گزرے تو ایک اخبار کے نمائندے نے ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران میں ہندوستان کے اس عظیم الشان شاعر نے اسلام اور مسائلِ حاضرہ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا اُن کا ایک مختصر سا مرقع ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے کہا کہ اسلام تمام بنی نوعِ انسان کے لئے اتحاد اور اخوت کا پیغامبر ہے اور ملوکیت کا نظام جس میں زبردست زیردستوں کا شکار کرتے ہیں اور اُن کا خون چوس کر پرورش پاتے ہیں اسلام کے بلند مقاصد میں حائل ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ میرے دل میں کسی قوم یا کسی ملت کے خلاف کسی قسم کا تعصب نہیں ہے۔ میری آرزو صرف اس قدر ہے کہ اسلام ایک دفعہ پھر اپنے دورِ اول کی سادہ اور دلآویز صورت میں جلوہ گر نظر آئے۔ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ ہندوستانی مل جل کر صلح و آشتی سے رہیں۔ انہیں یقین ہے کہ خواہ ہر قوم اپنی انفرادی ہستی اور اپنے تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھے پھر بھی اس قسم کا اتحاد اور صلح جویانہ تعلقات بالکل ممکن ہیں۔

ملوکیت کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے اظہارِ خیال کے لئے درخواست کی گئی تو انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں ملوکیت کا ہر ایسا نظام جو دوسروں کو پامال کرتا ہو غیر مقدس ہے۔

ڈاکٹر صاحب سرمایہ داری کے مخالفین میں سے ہیں۔ موجودہ ملاقات میں انہوں نے اس بات کو بہت اہمیت دی کہ قرآن زمین کو ذاتی ملکیت کے طور پر استعمال کرنے کا مخالف ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا گیا کہ آپ اپنے اُن نیک نیت نقادوں کو کیا جواب دیں گے جن کا خیال ہے کہ "سیاست دان اقبال" "شاعر اقبال" پر غالب آگیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کا موجودہ طرزِ عمل آپ کی شاعری سے ہم آہنگ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "اپنی ذات کے متعلق کسی قسم کے خیالات کا اظہار میرا کام نہیں۔ یہ میرے نقادوں کا کام ہے مگر یہ ضروری ہے کہ وہ میرے متعلق جو رائے بھی قائم کریں میری تحریروں کے مطالعہ کے بعد قائم کریں۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بہت کم نقاد اُن کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ قوم پرستی کے متعلق میرے خیالات میں ایک خاص انقلاب آچکا ہے۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں میں بھی ایک پُرجوش قوم پرست تھا۔ حالانکہ اب میں ایسا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب میں زیادہ صحیح طور پر

سوچ سکتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میری بعد کی تمام تصانیف فارسی زبان میں ہیں جو اس ملک میں بہت کم سمجھی جاتی ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ ریاستوں کے نظام کی بقا کے حامی ہیں۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ دل سے میں جمہوریت کا قائل بھی نہیں ہوں۔ جمہوریت مجھے محض اس لئے گوارا ہے کہ اس کا کوئی بہتر بدل موجود نہیں۔

دورانِ ملاقات میں اقبال سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ سیاسی رہنما کے بجائے آپ شاعر کی حیثیت میں ملک کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ادبیات سے میری دلچسپی کم نہیں ہوگئی، نہ میں نے وہ شغل ترک کیا ہے۔ فی الحقیقت اب بھی میں ادبیات ہی کو اپنا اہم ترین کام سمجھتا ہوں۔

سوال کیا گیا کہ "مجلسِ اقوام" اور کانفرنسوں کے فریب کا پول کھولنے میں آپ نے سب سے زیادہ سرگرمی سے حصہ لیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ احساس کیوں ہوتا ہے کہ آپ کو گول میز کانفرنس" پر بہت اعتماد ہے۔ کیا آپ اپنے اس طرزِ عمل کی توجیہ کرنے کی تکلیف کر سکتے ہیں۔

شاعر اس سوال کا جواب دینے کے بجائے اطمینان سے اپنا حقہ پینے میں مشغول ہو گیا۔

اس سوال پر کہ آپ قوم پرستی کے مخالف کیوں ہیں؟ ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا کہ قوم پرستی اسلام کے بلند تر اصول کی راہ میں حائل ہے۔ اسلام کسی عقیدہ کا نام نہیں۔ یہ ایک مکمل معاشرتی دستور ہے۔ اس نے نسل و رنگ کا امتیاز مٹا کر ایک اہم ترین مسئلہ حل کیا ہے۔ یہ تمام بنی نوعِ انسان کے دل و دماغ کو ایک مشترک روش پر لا ڈالنا چاہتا ہے۔ اسی نے اول اول نوعِ انسان میں اتحاد اور روحانی اشتراک کا خیال پیدا کیا۔ عہدِ حاضر کی قوم پرستی اس بلند نصب العین کے لئے ایک رکاوٹ ہے۔ اور یہی قوم پرستی کے خلاف میری دلیل ہے۔

عربی ممالک میں اتحاد کے امکان کے متعلق ڈاکٹر اقبال سے سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں ایسے اتحاد کا حامی ہوں لیکن بہ حالاتِ موجودہ اس کے راستے میں بہت سی مشکلات ہیں۔ انہوں نے کہا عربی زبان کو میری نظروں میں بہت وقعت حاصل ہے۔ میرے خیال میں مشرقی زبانوں میں یہی ایک زبان ہے جس کا مستقبل ایک زندہ رہنے والی زبان کا مستقبل ہے۔ مذہب کے بعد عربی اقوام میں ان کی زبان کو ان کا سب سے بڑا رشتۂ اتحاد تصور کرتا ہوں۔

ڈاکٹر اقبال کا خیال ہے کہ اسلام کے مستقبل کی تشکیل میں ہندوستانی مسلمانوں کا حصہ غالباً بہت اہم ہوگا۔ اسلام کو اپنے ان تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بہت سی توقعات ہیں جنہیں اعلیٰ تعلیم کے علاوہ اسلام اور اسلامی معاملات سے ضروری واقفیت حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر علما موجودہ اقتصادی اور سیاسی مسائل سے ضروری واقفیت حاصل

کرلیں تو گذشتہ حالات کا علم اُن کو اسلام کے مستقبل کے متعلق سوچنے میں بہت مدد دے سکتا ہے اور اس طرح وہ اسلام کی بہت بڑی خدمت کر سکتے ہیں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہے میں نے اپنی حقیر کوششیں اس مقصد کے لئے صرف کی ہیں اور مجھے امید ہے کہ ابھی میں اس کے متعلق اور بھی لکھوں گا۔

میں نے اسلامی فلسفے کا مطالعہ نئے فلسفے کی روشنی میں کیا ہے۔ اب میں یہی بات فقہ کی مدد سے کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں محض دینیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کے مقابلہ میں بہت اہم ہے۔

میں فقہ کو بہت اہمیت دیتا ہوں حالانکہ علما نے صدیوں سے اسے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ قرآن کا مطالعہ ایک ایسی کتاب کی حیثیت سے کرنا چاہئے جو قوموں کے ظہور، ارتقا اور زوال پر روشنی ڈالتی ہے۔ الہامی کتابوں کی تاریخ میں غالباً قرآن ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے قوموں کا ذکر زندہ اجسام کی حیثیت سے کیا جو دوسرے زندہ اجسام کی طرح جوان ہو کر بالآخر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ قرآن سمجھتا ہے کہ قومیں بعض خاص قوانین کے تابع رہی ہیں اور وہ ان قوانین کے اخلاقی پہلو پر دوسرے پہلوؤں کے مقابلہ میں زیادہ زور دیتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر اقبال نے بتایا کہ وہ تقریباً تمام اسلامی ممالک کی سیاحت کی آرزو رکھتے ہیں لیکن روپے کی کمی اکثر ممالک کے سفر کی اجازت نہ دے گی۔ بہرحال انگلستان سے واپسی پر وہ مصر ضرور جائیں گے۔

دراصل وہ "تجدید دنیائے اسلام" پر ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں اور حالات کے مطالعہ کے لئے وہ تقریباً تمام اسلامی ملکوں میں پھرنا چاہتے ہیں، مگر پھر وہی وسائلِ سفر کی مشکل کا سوال ہے جس کے متعلق وہ فی الحال یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

امن یا جنگ؟

جنگِ یورپ کے خاتمے سے لے کر اب تک یورپ کے اربابِ سیاست عالمگیر امن کے مستقل قیام کی کوششوں میں مصروف رہے ہیں اور ابھی خدانخواستہ عرصۂ دراز تک انہی کوششوں میں مصروف رہیں گے۔ اس سلسلے میں اس وقت تک دو کانفرنسیں ہو چکی ہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ بحری جنگ کے امکانات کو کم کرنے کی کوئی تدبیر نکالی جائے۔ پہلی کانفرنس واشنگٹن میں اور دوسری لندن میں منعقد ہوئی۔ نتائج کے اعتبار سے یہ دونوں کوششیں مایوس کن ثابت ہوئیں۔ اب آئندہ سال ماہِ فروری میں ایک تیسری کانفرنس کا انعقاد جنیوا میں ہونے والا ہے تاکہ تخفیفِ اسلحہ کے مسئلے میں باہمی مشورے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صلح کے متعلق اچھی اچھی باتیں کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ ان زریں باتوں پر عمل کیا جائے۔

اس وقت دنیا کی متمدن اقوام سامانِ جنگ پر ہر سال نوے کروڑ پونڈ خرچ کر رہی ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم سے پہلے

ریاست ہائے متحدۂ امریکا آلاتِ حرب پر نو کروڑ بیس لاکھ پونڈ خرچ کرتی تھیں لیکن اب یہ خرچ سترہ کروڑ پچاس لاکھ پونڈ تک پہنچ گیا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں انگلستان اسی مد پر چھ کروڑ پونڈ خرچ کرتا تھا لیکن ۱۹۳۱ء میں یہ مصارف بڑھ کر گیارہ کروڑ دس لاکھ پونڈ تک پہنچ چکے ہیں۔ یہی کیفیت روس فرانس اور دیگر ممالک کے مصارفِ حرب کی ہے۔

امریکا کی تجویز ہے کہ آئندہ سات سال میں اپنے بیڑے کے لئے بیس کروڑ پونڈ کے صرف سے متعدد جنگی جہاز تیار کرے، کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ یہ تجویز اس زمانے میں قابلِ عمل قرار دی گئی ہے جب تمام دنیا کے ممالک کی مالیات نہایت مخدوش حالت میں ہیں۔

برطانیہ نے زہریلی گیسوں کے امتحان کے لئے بمقام پورٹن (سالزبری) ایک تجربہ گاہ قائم کر رکھی ہے۔ اس تجربہ گاہ پر صرف سالِ رواں میں ایک لاکھ ستر ہزار پونڈ خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ یہ رقم خطیر نہ صرف گھوڑوں بلیوں اور بکریوں پر بلکہ ان جانوروں کے علاوہ اُن نوجوان رنگروٹوں پر تجربے کرنے میں صرف ہوگی جنہوں نے گراں بہار شوتوں کے لالچ میں اپنے زندہ جسم زہریلی گیسوں کے اثر و نفوذ کے لئے وقف کر دیئے ہیں۔ اس طرح نئی نئی زہریلی گیسوں کی خاصیتیں دریافت کی جا رہی ہیں تا کہ آئندہ جنگ کے موقع پر ہلاکت پھیلانے میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

دنیا میں امن کا قائم کرنا کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ یورپ کا دماغ اس قسم کے مہلک تجربوں کے امتناع کے لئے کسی بین الاقوامی مفاہمت تک پہنچ سکے۔

جنگِ عظیم کے مہیب نقصانات کی فہرست پر صرف ایک نظر ڈالنے سے دل کانپ جاتا ہے۔ اس جنگ میں ایک کروڑ انسان ہلاک ہوئے جو اپنے پیچھے دو کروڑ زخمی، نوے لاکھ یتیم اور پچاس لاکھ بیوائیں چھوڑ گئے!

جس قدر بارود زہریلی گیسیں اور جنگی جہاز زیادہ تیار کئے جائیں گے اُسی قدر جنگ کے موقعے زیادہ پیدا ہوں گے اور انسان کی وحشیانہ حسِ نبرد سرفت بیدار رہے گی۔ تفہیم امن کا راستہ یہ ہے کہ باہمی بدگمانیاں دور کی جائیں۔ ایک قوم دوسری سے خوف کھانا چھوڑ دے اور اربابِ سیاست کی نیتیں حرص کینے اور سازش سے پاک ہوں۔

سابق قیصر کی سیرت کا ایک روشن پہلو

گذشتہ جنگِ عظیم میں خون و آتش کا جو ہولناک کھیل کھیلا گیا اُس کا سب سے بڑا ذمہ دار سابق قیصرِ جرمنی سمجھا گیا ہے اس لحاظ سے شاید اکثر لوگوں کے نزدیک قیصر دنیا کا سب سے بڑا سنگدل اور تہی القلب انسان ہے۔ جنگ کے آغاز سے لے کر اس وقت تک مہذب دنیا نے کبھی قیصر کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا۔ اس لئے شاید ذیل کی دلچسپ کہانی جو قیصر کی سیرت پر ایک نئے انداز میں روشنی ڈالتی ہے اکثر لوگوں کے لئے باعثِ انشراح ثابت ہوگی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی رحم و مروت

کی آسمانی صفات سے لازماً خالی نہیں ہوتا۔

حال ہی میں فیلڈ مارشل سر جان فرینچ کے سوانح حیات پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں ایک واقعہ درج ہے کہ سابق قیصر نے ایک موقع پر ایک انگریز افسر کو جو جرمنی کا اسیر جنگ تھا محض اعتبار پر تین ہفتے کی رخصت دے دی تاکہ وہ اپنی بیمار ماں سے ملاقات کر سکے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایسٹ سرے رجمنٹ کا کپتان کیمبل زخمی ہو کر جنگی قیدی کی حیثیت سے قیصر کی فوج کے ہاتھوں میں پڑا اسی وقت کپتان کو اپنی ماں کی شدید علالت کی اطلاع ملی۔ ماں بیٹے کو ایک دوسرے سے انتہائی محبت تھی بلکہ ماں بیٹے کی پرستش کرتی تھی۔ اُسے اپنے بیٹے کے افسوسناک انجام سے سخت صدمہ ہوا۔ ادھر کپتان ہسپتال میں پڑا ہوا ہر وقت اپنی ماں کی علالت کے خیالوں میں محو رہتا۔ اُسے امید نہ تھی کہ جرمنی کا جنگی دفتر اُسے اُس کی ماں سے ملنے کی رخصت دے گا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر مجھے رخصت مل جائے تو غالباً میری ماں کی جان بچ سکتی ہے۔ آخر اس نے امید کے خلاف امید باندھی اور قیصر کے نام ایک ذاتی عرضداشت اس مقصد کے لئے بھیجی۔ کپتان کی حیرت اور مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُسے علم ہوا کہ قیصر نے اُس کی مطلوبہ رخصت کی درخواست منظور کر لی ہے۔

فونتین بلو کا محل ——— کتب خانہ

فونتین بلو کا محل پیرس سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ خاص نپولین کا محل ہے جسے اُس نے ورسائی کو چھوڑ کر جہاں فرانس کے قدیم لوئی بادشاہوں کے محل اور باغ تھے اور جہاں فرانس کے بادشاہ انقلاب فرانس سے قبل رہتے تھے بنوایا تھا۔ اس محل کے دوسری طرف فونتین بلو کا جنگل ہے جو فرانس کے سب سے خوبصورت جنگلوں میں ہے۔ مقابل کی تصویر میں اس محل کا کتب خانہ دکھایا گیا ہے۔ کتب خانے میں ایک تحریر محفوظ ہے جس میں لکھا ہے کہ اتحادی دول کی مرضی کے مطابق (جو فرانس کے خلاف تھیں اور جن کے ہاتھوں نپولین نے شکست کھائی) مَیں فرانس کے تخت و تاج کو چھوڑتا ہوں تاکہ یورپ میں امن قائم رہے۔ اسی محل کے اندرونی صحن میں کھڑے ہو کر نپولین نے ایلبا کے جزیرے میں جلاوطن کئے جانے سے قبل اپنے سپاہیوں کو خطاب کیا۔ اس محل میں نپولین کے تخت کا کمرہ، سونے کا کمرہ، کونسل کا کمرہ وغیرہ سب اِس وقت تک خوب سجے سجائے موجود ہیں۔

اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے

قافلۂ بہار را طائرِ پیش رس نگر
آنکہ بخلوتِ قفس گفت پیامِ خویش را

ذیل کے مضمون کے متعلق چند تمہیدی کلمات کہنے کی ضرورت ہے۔ کلامِ اقبال کی تنقید کے سلسلے میں اگرچہ اس سے پہلے بھی بعض اچھے مضمون لکھے جا چکے ہیں لیکن اس مسئلہ پر کہ اقبال کی شاعری کی صحیح حیثیت خیالی یا تفریحی نہیں بلکہ عملی ہے غالباً اس وضاحت اور خوبی سے کبھی بحث نہیں کی گئی۔ کسی چیز کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے فراست کے علاوہ اس چیز کے ساتھ کامل ہمدردی کا ہونا لازم ہے اور یہ دونوں باتیں اس مضمون میں بوجہ احسن جمع ہیں۔ البتہ ایک موقع پر جہاں اقبال کی عملی زندگی کو قابلِ اعتراض ٹھیرایا گیا ہے ہمیں فاضل مضمون نگار سے اختلاف ہے اور اس اختلاف کا اظہار ضروری ہے یہ اختلاف ہمیں دو وجہ سے ہے۔

اول اس لئے کہ اقبال کا عمل کسی طرح بھی اس کے قول کے خلاف ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال نے جن سہ گانہ نکتے یعنی استحکامِ نفس، ربطِ ملت اور عشقِ مرکز کو تکمیلِ انسانیت کا ذریعہ قرار دیا ہے ان کی خلاف ورزی اس سے کبھی نہیں ہوئی۔ کم از کم ایسی کوئی شہادت ہمارے پاس موجود نہیں حالانکہ اس کے برعکس شہادت موجود ہے۔

دوسری اور اصلی وجہ اختلاف یہ ہے کہ درحقیقت ہمارے نزدیک اقبال کی زندگی سراپا عمل ہے۔ یعنی نہ صرف یہ صحیح ہے کہ اقبال نے اپنے قائم کردہ اصولِ حیات سے کبھی انحراف نہیں کیا بلکہ یہ بھی صحیح ہے کہ اس کی زندگی اس اصولِ حیات کے عین مطابق ہے۔ اقبال اپنی قوم کی زبوں حالی کو دیکھ کر بے حس اور خاموش نہیں رہا بلکہ شبانہ روز غور و فکر اور کاہش و جگرسوزی کے بعد اُس نے ایک عظیم الشان نصب العین قوم کے سامنے پیش کیا ہے، اور ایک بے پناہ قوت کے ساتھ قوم کو اس نصب العین کی طرف بڑھنے کی دعوت دے کر ہمیشہ کے لئے روح کی بالیدگی کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ ایسے پیغام کا پیش کرنا کسی بے عمل آدمی کا کام نہ تھا بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے یقیناً اقبال نے اپنے دماغ اور روح کی بہترین طاقتوں کا پورا استعمال کیا ہے۔ یہی اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ اور یہی اس کا سب سے بڑا عمل ہے۔ اس

بحث میں مغالطہ ہمیشہ اس لئے ہوتا ہے کہ عمل کی تعبیر محض کسی قوت کے براہِ راست مادی ظہور سے کی جاتی ہے حالانکہ عالم محسوس کے علاوہ عالمِ روح میں کوئی زبردست انقلاب پیدا کرنا بھی بالکل صحیح طور پر اعلیٰ درجے کا عمل ہے۔ ہم کو یہ حق ضرور حاصل ہے کہ ذاتی طور پر ہم عمل کی ایک شکل کو دوسری شکل پر ترجیح دیں لیکن ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ایک صورتِ عمل کو تو عمل تسلیم کریں اور دوسری کو بے عملی قرار دیں۔

اقبال نے میزینی اور کارل مارکس کی طرح سیاسی یا اقتصادی تنظیم کی شکل میں کوئی کارنامہ دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا لیکن میزینی اور کارل مارکس نے بھی اقبال کی طرح اپنے دل کی تڑپ نکال کر ایک زندہ رہنے والے "پیغام" کی شکل میں پیچھے نہیں چھوڑی۔ اگر وہ "کردار کا غازی" بنتا تو "گفتار کا غازی" بننے سے اس کو یقیناً دست کش ہونا پڑتا آئندہ چل کر جب میزینی اور مارکس اپنے ملک اور جماعت میں محض محترم اور عزیز ناموں کی حیثیت سے یاد رہ جائیں گے، اقبال کی زندہ شخصیت کی زندہ تصویر قوم کے سامنے ایک غیر فانی قوت کی طرح باقی رہے گی۔

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

انسان ایک حیوان بے قرار ہے۔ اور اس کی بے قراری کا سب سے بڑا سبب اس کا تخیل ہے تخیل انسان کی وہ روحانی خاصیت ہے، جو اسے مادی کامیابیوں پر نازاں ہونے سے روکتی ہے جب تخیل ایک مرکز پر قائم ہو جاتا ہے تو وہ مرکز انسان کا مقصد بن جاتا ہے۔ وہ تعلق جو انسان کو اس مرکز سے ہے، اگر جذباتی صورت اختیار کرے تو عشق ہے۔

انسان کی بے قراری کو کم کرنے کے لئے قدرت نے اسے ایک اور قوت بخشی ہے جو مختلف اشیا کو ایک دوسری سے متمیز کرتی یا مطابقت دیتی ہے۔ ہمارے ذہنی معلومات اور نتائج کو یکجا کر کے انہیں ایک نظام کی صورت بخشتی ہے۔ اور انسان کو حفاظتِ زندگی اور سکون و عیش کا سبق سکھاتی ہے۔ یہ عقل ہے۔

اگر عقل کا کام مختلف واقعات کے اسباب و نتائج پر غور کرنا یا زندگی کے ذرائع اور وسائل سوچنا ہے تو عشق کا کام کسی مقصد کی خاطر زندگی کو قربان کرنا ہے عقل کی غرض و غایت محض انفرادیت ہے۔ مگر عشق کبھی انفرادیت سے وابستہ نہیں ہوتا۔ عیش کے مقاصد کی کوئی حد نہیں عشق کسی خوبصورت عورت سے بھی ہو سکتا ہے کسی علم یا فن سے بھی اور کسی بے جان بت سے بھی۔ ان سب مقاصد میں نوعی اختلاف ہے سب سے اعلیٰ مقصد وہ ہے جو بنی نوع انسان کی اجتماعی اور روحانی زندگی سے وابستہ ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جسے ایک عورت سے عشق ہے کسی ایسے مصلح یا ریفارمر سے بہت مختلف ہے جسے انسانوں کی اجتماعی فلاح سے عشق ہو اگرچہ دونوں کو ایک ہی سی روحانی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ تاہم ان کے مقاصد

کی نوعیت ان کی شخصیت میں ایک عظیم الشان فرق پیدا کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر میں قیس عامری اور رسول عربی کا مقابلہ کرونگا قیس کو ایک عورت سے عشق تھا۔ اور رسول عربی کو بنی نوع انسان سے۔ دونوں نے اپنے اپنے عشق کی بدولت ہزاروں اذیتیں اٹھائیں مگر چونکہ دونوں کے مقاصد کی نوعیت جدا تھی۔ اس لئے دونوں کی شخصیت، دونوں کے دائرۂ عمل نتیجۂ عمل اور طریقۂ عمل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عشق کی شان اُس کے مقصد کی وسعت سے ہی۔

ایسے وسیع عشق کی اشاعت کرنا پیغمبری ہے۔

کسی مقصد کی اشاعت کرنے کے دو طریق ہیں عمل اور قول۔ اور دونوں ضروری ہیں جس پیغمبر میں قول اور عمل مطابق ہوجائیں وہ مکمل پیغمبر ہے مگر ایسا ہونا دنیا کے معمولی واقعات میں سے نہیں۔ عموماً انسانوں کا عمل ان کے قول کے مطابق نہیں ہوتا۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے۔ یہ بات سوائے رسول کریمؐ کے اور کسی میں نہیں۔ اور آپ کی شخصیت کا وہ عالم ہے کہ ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

مگر چونکہ عام انسانوں کے قوائے عمل کمزور ہوتے ہیں۔ اس لئے عمل کی بجائے اگر صحیح کوشش عمل ہی موجود ہو۔ تو وہ بھی بڑی بات ہے۔

عشق زندگی کے بنیادی حقائق میں سے ہے۔ اس کا پیغام زندگی کا سب سے عظیم الشان پیغام ہے۔ اور اس پیغام کے پہنچانے والے کو میں پیغمبر کہتا ہوں۔ میں نے یہ سب کچھ اس امر کے واضح کرنے کے لئے کہا ہے کہ میں نے لفظ "پیغمبر" کو کسی طرح بھی کوئی مذہبی رنگ نہیں دیا۔ نہ ایسے کسی مشکوک مفہوم ہی میں استعمال کیا ہے۔ میرا مطلب بالکل صاف ہے۔ اقبال کو پیغمبر کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ اقبال نے زندگی کے بنیادی حقائق کو ہمارے سامنے پیغام کی صورت میں پیش کیا ہے اور ہمارے لئے ایک مخصوص راہِ عمل منتخب کی ہے۔ میں اقبال کی شخصیت اور نبوت میں مطلق کوئی خلط مبحث نہیں کرنا چاہتا۔

(۱)

اقبال کے متعلق کسی قسم کی گفتگو کرنے سے پہلے اُس کی شخصیت کا اندازہ کرنا لازم ہے۔ حضرت عیسٰی کا قول ہے کہ "جو لوگ میرے موافق نہیں ہیں وہ میرے مخالف ہیں"۔ میرے خیال میں کسی عظیم شخصیت کا بہترین معیار یہی ہے۔ کہ ہم اسے نظر انداز نہ کر سکیں۔ نپولین کے متعلق ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں مگر ان سب میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں ملے گی جس میں مصنف نے اس کی زندگی کے واقعات پر معمولی سا تبصرہ کر کے قصہ ختم کر دیا ہو۔ یا تو نپولین کی اچھی خاصی مذمت کی ہوگی۔ یا مدح و ستائش یا کم از کم جلدی سے کوئی فیصلہ نہیں دیا ہوگا۔

یہی حال اقبال کا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اقبال کے متعلق کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ صرف وقتاً فوقتاً رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ جہاں تک اِن آرا کی نسبت میرا تجربہ ہے وہ یا تو صریحی طور پر موافق ہیں یا مخالف۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اقبال میں معمولی انسانوں کی طرح کچھ خوبیاں اور کچھ برائیاں ہیں۔ اور یہ خوبیاں اور برائیاں قریبًا قریبًا برابر ہیں۔ اقبال کی فطرت کے چند پہلو اس قدر نمایاں ہیں، اس کی طبیعت اس قدر "یکطرفہ" واقع ہوئی ہے، کہ اس کی نسبت جو کچھ بھی کہا جائے۔ وہ نیم گرم الفاظ میں نہیں کہا جا سکتا۔ مثال کے طور پر عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ قول لیجئے کہ "اقبال ہمارے زمانے کا مسیحا ہے جو مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے آیا ہے۔" برخلاف اس کے میرے ایک دوست فرمایا کرتے ہیں۔ کہ اقبال کے کلام میں نہ "شعریت" ہے۔ اور نہ اثر۔

(۲)

اس سلسلے میں اقبال کے متعلق چند تنقیدی غلطیوں کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ جو وقتاً فوقتاً لوگوں کی زبان یا قلم سے سرزد ہوتی رہی ہیں۔ سب سے پہلے میں اردو کے ایک مشہور اور محترم ادیب کی طرف اشارہ کروں گا جو اپنے ایک مضمون میں اسرار و رموز اور پیام مشرق کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"فارسی میں اقبال کے قلم سے تین کتابیں اس وقت تک نکلی ہیں۔ "اسرار خودی"۔ "رموز بے خودی" اور "پیام مشرق" ایک سے ایک بہتر۔ پہلی کتاب سے دوسری میں زبان زیادہ سادہ اور عام فہم ہوگئی ہے۔ اور تیسری دوسری سے زیادہ سلیس ہے"

اس سے کچھ آگے چل کر کہا ہے :۔

"پیام مشرق میں ہمارے مصنف نے یورپ کے ایک نہایت بلند پایہ شاعر گوئٹے کے "سلام مغرب" کا جواب لکھا ہے اور اس میں نہایت حکیمانہ خیالات کا اظہار بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے اس کے اشعار میں بعض بڑے بڑے عقدے حل ہوتے ہیں۔ جو پہلے ایسے آسان طریق سے بیان نہیں ہوئے تھے۔"

میں اس نقطۂ خیال کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ صرف نہایت ادب سے اتنا عرض کروں گا کہ پیام مشرق کوئی فلسفے کی کتاب نہیں ہے بلکہ اُن لوگوں کے لئے جو سنتے اور سمجھتے ہیں ایک پیغام ہے جس کی عظمت و اہمیت کا معیار اس کی دقیقہ رسی اور کُنج کاوی یا اُس کے پیرایۂ اظہار کی سلاست و روانی نہیں بلکہ اس کی وہ روح ہے جو ایک انسان کی زندگی کو ایک نئی صورت، ایک نئی وسعت دیتی ہے۔ ویسے عقدے حل کرنے کو تو نظیری بھی کر گیا ہے ؎

عقل بر قعِ زرخ کشود ایں جا	نزدِ تو جبرئیل وحی آورد
جزو و کل ہست در سجود ایں جا	کرد انا نیّت از سجود ابا

اسی طرح بانگِ درا کے متعلق بھی جس کو انہوں نے ایک "مجموعۂ دلپذیر" کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ صرف یہی کہ دینا کافی ہے کہ وہ ناسخ و آتش یا داغ و امیر کے اشعار کی طرح کوئی مجموعۂ دلپذیر نہیں کچھ اور ہے۔

ایک اور تنقیدی غلطی جو بہت عام ہے زیادہ تر اہلِ لکھنؤ سے سرزد ہوتی ہے۔ وہ لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ اقبال "فنِ شاعری" سے بے بہرہ ہے۔ میرے ایک دوست جو خود ایک خوشگو شاعر ہیں اور باوجود پنجابی ہونے کے لکھنوی خیالات سے مالا مال ہیں۔ اقبال کے کلام کی چند ترکیبوں کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "میں انہیں فصیح نہیں سمجھتا۔ دہلی اور لکھنو دونوں جگہ کی روزمرہ بول چال میں متروک ہیں۔ . . . . فن میں اقبال کی پیروی میرے نزدیک ناجائز ہے۔ بانگِ درا اٹھا کر دیکھئے۔ اقبال میں فن کی بہت سی اغلاط موجود ہیں۔ اگرچہ وہ تخیل کا بادشاہ ہے"۔ اس کے بعد میرے کرمفرما چند "اساتذہ فن" کا نام لیتے ہیں یعنی وحشت۔ شوق قدوائی۔ حسرت موہانی۔ سید سلیم وغیرہ

اقبال پر ماہرِ فن نہ ہونے کا اعتراض (جس کی غلطی سے میں اس جگہ بحث نہیں کروں گا) اس لئے بہت مقبول ہے کہ عموماً زبان کی شستگی۔ ترکیبوں کی چستی۔ بندش کی صفائی۔ الفاظ کی خوبصورتی۔ اور محاورہ و روزمرہ جیسی چیزوں ہی کو شاعری سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں بذاتِ خود اور حقیقی جذبات کے بغیر (جو لکھنوی شاعری میں قطعاً مفقود ہیں) محض بے معنی ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے ایک مرحوم پروفیسر صاحب کا قول اکثر یاد آتا ہے۔ جو فرمایا کرتے تھے کہ "اقبال کہاں کا شاعر ہے۔ یہ کیا ہے کہ دو چار نظمیں دو چار غزلیں لکھ دیں۔ آئے تو ذرا قصیدہ لکھ کے دکھائے" میرے پاس اس کا جواب اُس وقت تھا۔ اور نہ اِس وقت ہے۔

اقبال کی خوبیاں اور خامیاں دکھانے کے لئے یا تو اُسے صرف سخن گو کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اور یا صرف فلسفی کی حیثیت سے۔ یا ان دونوں کو ملا کر فلسفی سخن گو کی حیثیت سے۔

ان تنقیدی غلطیوں کے علاوہ بے شمار غلط فہمیاں اور بھی ہیں۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ عوام الناس میں جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ اقبال کو "علامہ اقبال" کہتے ہیں۔ جو جاہل ہیں اور اس کے منہ سے نظمیں سنتے رہے ہیں وہ اسے گویا سمجھتے ہیں۔ "دیندار" لوگ اسے "داڑھی منڈا" اور "کافر" سمجھتے ہیں۔ سنّی اسے شیعہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اسے امام حسین اور حضرت علی سے بے حد عقیدت ہے۔ شیعہ اُسے سنّی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا مداح ہے۔ وہابی اسے پیر پرست کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ درگاہِ محبوب الٰہی پر اپنی التجا لے کر گیا۔ پیر پرست لوگ اسے وہابی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ بڑے بڑے پیروں سے نوک جھونک کیا کرتا ہے۔ دیوبندی خیالات کے علما اقبال کو ایک آزاد خیال ملحد سمجھتے ہیں۔ اور لامذہب نوجوان اسے تنگ نظر اور مذہب کی زنجیروں کا اسیر ٹھیراتے ہیں۔ کیونکہ اگر ایک طرف وہ فروعات کو چنداں ضروری خیال نہیں کرتا تو دوسری طرف اسے اسلام کے اصولوں سے ایک غیر فانی محبت ہے۔ سب سے آخری اور سب سے انوکھا الزام اس پر یہ لگایا گیا کہ وہ بابی ہے الزام کونسل کے انتخابات کے دوران میں لگایا گیا تھا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے اپنے ولایت کے قیام کے زمانے

میں مشہور بابی شاعرہ قرۃ العین پر ایک محققانہ مضمون لکھا تھا۔ انہی باتوں کو دیکھ کر اقبال نے کہا ہے کہ ؎

سُن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں
رند کہتا ہے ولی مجھ کو ولی رند مجھے
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا (فریادِ امت)

(۳)

یہ سب کچھ بہت افسوسناک ہے۔ مگر سب سے بڑھ کر افسوس اس بات کا ہے کہ اقبال کے پیغام کو صحیح طور پر سمجھنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے بلکہ اگر دو تین مضامین میری نظر سے نہ گذرتے تو میں یہ کہہ دیتا کہ کبھی کی ہی نہیں گئی۔ اقبال ایک پیغمبر تھا جو لوگوں کے لئے ایک پیغام لایا۔ اور لوگ اس کے پیغام سے غافل رہے ؎

کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم
آں متاعم کہ شود دست زدِ بے بصراں (پیام مشرق)

یہ زیادہ تر اسی غفلت کا نتیجہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو مطلقاً تنہا محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ ہر ایک انسان اپنی اپنی جگہ بالکل تنہا ہے، پھر بھی عام انسانوں کو یگانے مل جاتے ہیں جو انہی کی طرح عام انسان ہوتے ہیں۔ اقبال کو اقبال ہونے کی بڑی سزا یہی ملی ہے کہ وہ تنہا ہے۔ اور اُسے اپنا کوئی ہمدم نظر نہیں آتا ؎

ہنوز ہم نفسے در چمن نمی بینم
بہاری رسد و من گلِ نخستینم (پیام مشرق)

میں نے اقبال کے پیغام کو سننے والے بہت ہی کم دیکھے ہیں اور جو دیکھے ہیں وہ زیادہ تر موجودہ نسل کے نوجوان ہیں۔ باقی سب اپنی اپنی جگہ کوئی نہ کوئی مستقل غلط فہمی لئے بیٹھے ہیں جسے وہ بالائے طاق بھی نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ ان کا سارا سرمایہ وہی ہے

(۴)

ان غلط فہمیوں کے بہت سے وجوہ ہیں۔ سب سے پہلی اور سب سے بڑی وجہ ہم ہندوستانیوں کی ازلی کور ذوقی اور دوں فطرتی ہے۔ دوں فطرتی اس لئے نہیں کہ ہمیں سیاسی یا اقتصادی آزادی نصیب نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے حد درجے کے کاہل واقع ہوئے ہیں۔ ہم حقائق سے ڈر جاتے ہیں۔ زمانۂ حال سے گھبرا کر زمانۂ ماضی کے افسانوں میں پناہ لیتے ہیں، کیونکہ ایسے افسانے دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور دلچسپ اس لئے ہوتے ہیں کہ انسان انہیں دلچسپ بنا لیا کرتا ہے۔ ہمیں خواب آور چیزوں سے محبت ہے۔ جو شخص ہمیں جگائے یا چاہے کہ ہم اپنی زندگی کے بے کار لمحوں کو کسی عمل یا کوشش عمل سے کار آمد بنائیں، ہم اس سے خفا ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے ہمارے مرض کی تشخیص کی ؎

بخواب رفتہ جوانان و مردہ دل پیراں
درونِ سینۂ کس آہِ صبحگاہے نیست (پیام مشرق)

اُس نے چاہا کہ ہمیں اس خواب سے جگائے - اور یہ اس کا سب سے بڑا گناہ تھا -

دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اقبال شہرت عام کو پسند نہیں کرتا کوئی اسے اچھا کہے یا بُرا وہ اس سے بے نیاز ہے - وہ ایک فقیر راہ نشین ہے - اور دنیا کی ستائش سے مستغنی - اس نے اپنے لئے کوئی شاعرانہ یا فلسفیانہ بھروپ نہیں بھرا - اگر وہ رومن کیتھو کی طرح ننگے پاؤں پھرا کرتا - یا اٹلی کے موجودہ مختار مسولینی کی طرح اپنے ماتھے پر ایک مصنوعی تیوری پیدا کر لیتا - یا بائرن کی طرح شاعرانہ سی صورت بناتا تو لوگ ضرور اس کی قدر کرتے کیونکہ لوگ ایسے ایسے بازیگروں کی قدر کیا ہی کرتے ہیں - ہمارے زمانے میں شخصی پراپیگنڈے کا بہت زور ہے - ایک لمبی اور نورانی ڈاڑھی - لمبے لمبے کپڑے ، منہ پر گیان دھیان کی نمائشی مسکراہٹ ، طبیعت کی اندرونی کمی کو لباس کی ظاہری شان سے دُور کر سکتی ہے - اور ایک ہوشیار آدمی مہاتما بن کر بلا توقف تمام دنیا کا دورہ کر سکتا ہے -

کچھ عرصہ ہوا کہ یو پی کے ایک اخبار نویس نے اقبال پر ایک عجیب و غریب اعتراض کیا - وہ یہ کہ اقبال کو شاعرانہ وضع کا ایک دُنیا نوسی سا دبلا پتلا انسان ہونا چاہئے تھا - (جیسے یو پی کے شاعر ہوا کرتے ہیں) مگر وہ تو ایک اچھا خاصا پہلوان ہے - یہ اعتراض غور کے قابل ہے -

تیسری وجہ اقبال کی ناقدری کی یہ ہوئی - کہ اس کی زندگی کے ابتدائی اور آخری دور میں بہت زیادہ فرق ہے - پہلے دور کا اقبال اسرار و رموز کا اقبال نہ تھا - وہ فلسفی اور شاعر تھا - پھولوں - بادلوں اور ستاروں پر نظمیں لکھا کرتا تھا - زمانے کے تغیرات پر غور کیا کرتا تھا - ہر قسم کی قیود سے آزاد ہونا چاہتا تھا ؎

عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے
حسنِ عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
امتیازِ ملت و آئیں سے دل آزاد ہو

وہ ایک طفلِ شیر خوار کے تلون میں اپنے تلوّن کی تصویر دیکھتا تھا ؎

آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
تو تلوّن آشنا ، میں بھی تلوّن آشنا

وہ گذرتے ہوئے لمحوں کو عیش و عشرت میں گذارنا چاہتا تھا - اور جنت سے اسی لئے بیزار تھا کہ وہ دنیا میں نہیں ہے ؎ ۔

مقامِ امن ہے جنت مجھے کلام نہیں
شباب کیلئے موزوں ترا پیام نہیں
شباب آہ! کہاں تک امیدوار رہے
وہ عیش عیش ہی کیا جس کا انتظار رہے
وہ حسن کیا کہ جو محتاجِ چشمِ بینا ہو
نمود کے لئے منت پذیرِ فردا ہو
عجیب چیز ہے احساس زندگانی کا
عقیدہ "عشرتِ امروز" ہے جوانی کا

یا تو وہ حالت تھی یا یہ زمانہ آیا کہ اقبال ایک پیغمبر بن گیا۔ اور انسانوں کو زندہ رہنے کی تعلیم دینے لگا ؎

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

اقبال اب بھی جنت سے بیزار ہے مگر اس کی موجودہ بیزاری کی جو وجہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی فطرت میں ایک غیر معمولی انقلاب پیدا ہو چکا ہے ؎

دلِ عاشقاں بمیرد بہشتِ جاودانے
نہ نوائے دردمندے، نہ غمے نہ غمگسارے

یا ؎

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

گویا اقبال جنت سے اب اس لئے بیزار ہے کہ وہاں جدوجہد کا کوئی سامان نہیں۔

لوگ عموماً اس انقلاب کو جو گستاولیبان (مصنف "روح الاجتماع") کی اصطلاح میں ایک "حقیقی انقلاب" ہے نظرانداز کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اقبال کی طبیعت کا یہ تغیر جس قدر واضح ہے، اسی قدر غیر متوقع بھی۔ چنانچہ ایسے آدمی بہت سے موجود ہیں جو اقبال کے اشعار کو اب بھی اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے وہ اس کی ابتدائی غزلوں کو دیکھتے تھے

چوتھی وجہ اقبال سے بے توجہی کی یہ ہے کہ اس کا اصلی کلام، وہ کلام جس کے ذریعے سے اُس نے اپنا پیغام ہم تک پہنچایا۔ فارسی میں ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان کے جاننے والے بہت کم ہیں۔ اور روز بروز کم ہو رہے ہیں فارسی کی "پبلک" ہندوستان میں اگر تھی تو اُسی وقت جب نولکشور کے مطبع میں ہر قسم کا رطب و یابس شائع ہو رہا تھا۔ اور سر سید پر کفر کے فتوے لگ رہے تھے۔

مگر یہ وجہ کچھ ایسی زبردست نہیں سب سے زیادہ زبردست وجہ اقبال کے قول اور فعل کا فرق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال کی عملی زندگی وہ نہیں جو ہونی چاہئے ؎

گفتار کا غازی تو وہ بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اقبال کا عام طرز زندگی اس کی تعلیم کے صریحی طور پر خلاف نہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ اپنے مقرر کردہ معیار سے بہت نیچے ہے۔ میں اس معاملے میں اقبال کا مقابلہ میزینی یا کارل مارکس سے کرونگا یہ دونوں بھی ہمارے وقت کے پیغمبر ہیں۔ مگر ان کو اقبال پر فوقیت حاصل ہے۔ میزینی مرتے دم تک جمہوریت کے اصول کی اشاعت کرتا رہا۔ اس نے اپنی تعلیم کو ہر ممکن عملی کوشش سے پھیلایا حتیٰ کہ سپاہی بن کر جنگ بھی کی اور ایک مدت تک ایک اچھے خاصے علاقے کا خود بندوبست بھی کرتا رہا۔ کارل مارکس نے اپنی زندگی مزدوروں کی طرح، مزدوروں کو منظم کرنے میں گذار دی۔ وہ جس طرح اشتراکیت کا پیغمبر تھا۔ اسی طرح اس تحریک کا سب سے بڑا عملی رہنما بھی۔ اقبال میں یہ بات نہیں۔ مگر میں اقبال کے اس کمزور پہلو پر کچھ زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ قوتِ عمل خدا کی دین ہے۔ کسی کے بس کی بات نہیں۔

(۵)

اس طویل دیباچے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کیا ہے؟ اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک صحیح اور ایک غلط۔ میں غلط جواب کے متعلق بہت کچھ کہہ آیا ہوں۔ اس کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ ناکافی ہے۔ اور اقبال کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہے۔ اقبال نہ صرف فلسفی اور شاعر ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر پیغمبر بھی ہے شاعری اور فلسفہ اس کے پیغام کے ماتحت ہیں۔ قدرت نے اسے فلسفی اس لئے بنایا۔ کہ وہ اپنے پیغام کو لوگوں کے دماغوں پر نقش کر سکے۔ اسے شاعری اس لئے ملی کہ اس کا پیغام ایک جذباتی شکل اختیار کر کے لوگوں کے دلوں تک پہنچ سکے اگر ہم صرف یہی کہیں کہ اقبال ایک پیغمبر ہے۔ تو یہ بہت کافی ہے۔ مثلاً اقبال کہتا ہے ؎

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اس شعر میں مسلم کو مرغ حرم۔ رنگ و نسب کو غبار، اور رنگ و نسب سے آزاد ہونے کو پرفشانی سے تعبیر کرنا شاعری ہے۔ مگر یہ شعر محض تشبیہوں یا استعاروں کا مجموعہ ہرگز نہیں ہے۔ اس کا سب سے پہلا مقصد مسلمانوں کو رنگ و نسب کے امتیاز سے بلند ہونے کا سبق دینا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے ؎

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ　　　پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

یہاں ملت کو درخت سے اور فرد کو درخت کے پتوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ قوم کے انحطاط کا دور گویا خزاں ہے۔ اور عروج کا زمانہ بہار۔ مگر اس شعر کا مقصد بھی "ترکیبوں کی چستی" یا "تشبیہوں کی ندرت" نہیں۔ اقبال ہمر

یہ بتانا چاہتا تھا۔ کہ ایک فرد کو اپنی قوم کے ساتھ وابستہ رہنا چاہئیے۔ کیونکہ قوم کا عروج اس کا عروج ہے۔ اور قوم کا زوال اس کا زوال۔ یہ مطلب نثر میں بھی ادا ہو سکتا تھا۔ مگر جو صورت اُس نے اقبال کی زبان سے نکل کر اختیار کی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی چیز پُر اثر نہیں ہو سکتی۔ اور یہ اثر اس لئے ہے۔ کہ اقبال کی طبیعت تصنّع سے پاک ہے۔ اس میں حقیقی درد کی کمی نہیں ہے جس کو وہ الفاظ کی رنگینی سے دور کرنے کی کوشش کرے۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے۔ کہ اقبال کا کلام مجموعی طور پر یکساں نہیں ہے۔ اپنے ابتدائی اور آخری دور میں عموماً۔ اور درمیان کے زمانے میں کہیں کہیں اقبال ایک شاعرِ محض یا ایک فلسفیٔ محض کی حیثیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً یہ شعر ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں　　ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

جس کا مضمون ایک فلسفیانہ احساس ہے۔ یا یہ شعر ؎

اگر کاوی درونم را جبالِ خویش را یابی　　پریشاں جلوۂ چوں ماہتاب اندر بیابانے

جو ایک شاعرانہ کیفیت کا اظہار ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کا سارا کلام اُن معنوں میں "پیغمبری" ہے جو ہم نے لئے ہیں۔ میں نے صرف یہی کہا ہے کہ اقبال کی اولیں اور اہم ترین حیثیت ایک پیغمبر کی ہے۔ اور لوگ اس حیثیت کو سمجھنے سے عموماً قاصر رہتے ہیں۔ اقبال نے خود کہا ہے ؎

بہ خامہ کہ خطِ زندگی رقم زدہ است　　نوشتہ اند پیامے بہ برگِ رنگینم

جو لوگ نکتہ رس نہیں ہیں۔ وہ اس "برگِ رنگیں" کی رنگینیوں میں محو ہو جاتے ہیں۔ اور اس پیغام کو جو خامۂ قدرت نے اس پر لکھ رکھا ہے۔ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ "الفاظ کی خوبصورتی" اور "ترکیبوں کی چستی" سے بحث کرتے ہیں۔ اور اصل مقصد کو نہیں سمجھتے۔ ہندوستان ایسے لوگوں سے بھرا پڑا ہے اور اقبال ان کے ہاتھوں نالاں ہے۔ پیامِ مشرق کی افتتاحی مثنوی کے وہ شعر جو ؎

آشنائے من زمن بیگانہ رفت　　از خمستانم تہی پیمانہ رفت

سے شروع ہوتے ہیں۔ اسی دردناک حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اقبال کو اپنی تنہائی کا احساس زیادہ تر انہی نافہمیوں۔ کج فہمیوں اور غلط فہمیوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے "اسرارِ خودی" کے خاتمے پر ایک ہمدم کے لئے دعا بھی کی ہے ؎

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے | از رموزِ فطرت من محرمے
تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش | باز بینم در دلِ او روئے خویش

(۶)

دوسرے شاعروں میں اور اقبال میں ایک بڑا فرق یہ ہے۔ کہ اُن کو ایک مشاعرے کی ضرورت ہے اور اقبال کو ایک قوم کی بلکہ تمام بنی نوع انسان کی۔ اُن کو "حسنِ تخیل" اور "حسنِ ادا" اور ایسی ایسی باتوں کے لئے داد کی ضرورت ہے اور اقبال کو دنیا میں ایک انقلاب کی۔ وہ لوگ چند موزون مقفٰی فقرے اور ابیات لکھ کر انسانوں کی تفریح کے لئے سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اقبال اپنی دنیا کے لئے ایک نیا انسان، ایک پختہ تر انسان چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ موجودہ انسان (خصوصاً ایشائی انسان) کی سست عنصری سے بیزار ہے۔ وہ ایک آنے والے روحانی سیاسی اور تمدنی انقلاب کا پیغمبر ہے اور اسی انقلاب کے لئے بے قرار ہے ؎

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں! (زبورِ عجم)

اقبال کا کلام یا کم از کم اس کا بیشتر حصہ تفریحی عنصر سے قطعاً مبرّا ہے۔ ہم اقبال کا مطالعہ اس انداز سے ہرگز نہیں کر سکتے جیسے آج کل "رباعیاتِ عمر خیام" کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اقبال کی شاعری ہمارے ذہنی اور روحانی جمود کو دور کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ ہماری غفلت میں اضافہ کرنے کے لئے نہیں۔

اقبال کے کلام کا انقلابی پہلو بھی، جو یقیناً اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے، اقبال کی ناقدری کا سبب ہوا ہے۔ ہندوستان میں آریوں کے حملے سے لے کر آج تک کوئی اہم تمدنی انقلاب نہیں ہوا۔ ہندوستان کی تہذیب آج بھی وہی ہے۔ جو مسیح سے دو ہزار سال قبل تھی۔ تمدنی انقلاب ایک اجتماعی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہندوستان کی تہذیب کا سب سے بڑا تخیل قوم کے افراد کی ایک دوسرے سے علیحدگی ہے۔ یہ علیحدگی ہندوؤں کے ویدانتی اور غیر ویدانتی فلسفے، ذات پات کی سنگین پابندیوں، چھوٹی چھوٹی قوموں کے رسم و رواج کے کمل باہمی اختلاف، ہندی علم الاصنام سے متعلق لاتعداد انفرادی اور غیر انفرادی توہمات، غرض ہر ایک چیز میں جھلکتی ہے۔ اس تخیل کی ابتدا ہندوؤں میں ہوئی تھی۔ مگر یہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا بھی جزو اعظم بن چکا ہے۔

جس ملک کی فطرت یہ ہو۔ وہاں اقبال کی صدا کون سنے!

(۷)

افراد کی ایک دوسرے سے روحانی علیحدگی اور نفی خودی کا آپس میں بہت کچھ تعلق ہے۔ خودی کا استحکام صرف ایک اجتماعی ماحول میں ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب نے نفی خودی کے خیال کو جس قدر فروغ دیا ہے۔ اُس کی نظیر شاید عیسائیت کے ابتدائی دور کے علاوہ اور کہیں نہیں ملے گی۔ ایران کی حالت بھی کم و بیش یہی رہی ہے۔ مگر ایران میں سعدی اور مولانا روم جیسے آدمیوں کا پیدا ہو جانا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ اس ملک کی حالت ہندوستان کی حالت سے زیادہ مایوس کن نہیں ہو سکتی۔

اگر خودی اور نفی خودی کے مسئلے پر غور کیا جائے۔ تو آرین اقوام اور سامی اقوام کے نقطۂ خیال میں ایک بیّن فرق نظر آئے گا۔ آرین قوموں کی تہذیب میں نفی خودی اور نفی قوم کے خیالات ہمیشہ کام کرتے رہے ہیں۔ آج کل یورپ کی آرین اقوام میں جو خیالات اور خصائل اس کے برعکس موجود ہیں۔ وہ انہوں نے سامی اقوام سے سیکھے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلے ایک سامی قوم یعنی بنی اسرائیل ہی نے فرد کی شخصیت اور قوم کی جمعیت کا سبق سیکھا اور سکھایا۔ سامیوں کا سب سے بڑا تخیل جو نوع انسان کا سب سے بڑا تخیل ہے۔ توحید ہے۔ آرین اقوام کا سب سے بڑا تخیل "وحدت الوجود" ہے۔ اس اختلاف تخیل کا اثر عملی زندگی پر بہت زیادہ ہے۔ توحید کے ساتھ احکام الٰہی کی پیروی کا نصب العین وابستہ ہے۔ اور وحدت الوجود کے ساتھ انسانی تخیل کی تمام کائنات میں آوارگی، کائنات کی محسوس جزئیات کی پرستش، اور قوت عمل کا تدریجی جمود لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سامی نقطۂ نگاہ سے زندگی ایک میدان جنگ ہے۔ اور آرین نقطۂ نگاہ سے ایک تماشاگاہ حسن ایک سامی زندگی میں جو معنوی اعتبار سے سامی ہو۔ ایک ہی بڑا جذبہ ایک ہی بڑے مقصد کے لئے کام کرتا نظر آئے گا۔ برخلاف اس کے ایک آرین زندگی میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جذبات ایسے ہی چھوٹے چھوٹے مقاصد کے لئے آپس میں لڑتے بھڑتے نظر آئیں گے۔ آرین نقطۂ خیال کے لئے ایک نہایت جامع لفظ "عجمیت" ہے جو آج کل عموماً استعمال ہوتا ہے۔ سامی نقطۂ خیال کو "عربیت" کا لفظ جو رائج نہیں ہے۔ ظاہر کر سکتا ہے۔ کیونکہ عرب ایک سامی قوم ہیں اور عجمی یا فارس والے ایک آرین قوم۔

اقبال ایک کشمیری پنڈت ہے۔ یعنی اس کی رگوں میں بہترین قسم کا آرین خون ہے۔ مگر قدرت نے اُسے سامی نصب العین کا سب سے بڑا وکیل پیدا کیا ہے ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی

برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است ۔ (زبورِ عجم)

جہاں تک اس نصب العین کو پیش کرنے کا تعلق ہے۔ اقبال نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

(۸)

اقبال کی پیغمبرانہ حیثیت واضح کرنے کے بعد اس کے پیغام کی توضیح ضروری ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا بہتر ہوگا کہ اقبال کن چیزوں کی حمایت اور کن چیزوں کی مخالفت کے لئے آیا ہے۔ اقبال نے جن باتوں کے خلاف اپنی پوری قوت سے جہاد کیا ہے۔ اور میرے ذہن میں کوئی صورت حالات ایسی پیدا نہیں ہوسکتی۔ جو اسے ان کے موافق بنا سکے۔ اقبال سب سے پہلے سکون وجمود کا مخالف ہے۔ سکون وجمود ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو افراد اور اقوام کے لئے خودکشی کے معنی رکھتی ہے۔ زندگی ایک میدانِ کارزار ہے۔ پھولوں کی کیاری نہیں۔ یہاں جو شخص جد وجہد سے گھبرایا، اُس کی ہستی اور موت برابر ہے ؎

دریں رباطِ کہن چشمِ عافیت داری؟
ترا بہ کشمکش زندگی نگاہے نیست (پیامِ مشرق)

ایشیائی تہذیب کے دورِ حاضر کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس کی تاریخ ذہنی اور روحانی سکون وجمود کی ایک لمبی نیند نظر آئے گی جو جمال الدین افغانی کے وقت تک باقی تھی۔ اور جس کے اثرات اب بھی مشرق پر غالب ہیں۔ اس کی وجہ آب وہوا نہیں ہے۔ کیونکہ آخر اسی ایشیا سے تاتاری اور عرب اُٹھے تھے۔ اس کی وجہ ایشیائی فلسفہ اور ایشیائی شاعری ہے جس نے ہر ایک ایشیائی فرد کے لئے سکون وجمود کو ایک نصب العین کی حیثیت سے قائم کر دیا ہے۔ صوفیوں نے غالباً ویدانت کے فلسفے سے متاثر ہو کر "فنا فی اللہ" کا تصور باندھ رکھا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی انفرادی اور شخصی حیثیت کسی اور شخصیت میں جذب ہو جائے۔ تاکہ وہ زندگی کی کاہشوں اور گوناگوں ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو سکے۔

سکون وجمود کا نصب العین بہت عام ہے۔ حافظ۔ عمر خیام اور ٹیگور اس شاعر نے اس تخیل کو پوری جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے، اسی کے دلدادہ ہیں۔ یہ سب تسکین کی تلاش میں ہیں۔ اور دنیا چونکہ عرصۂ جد وجہد ہے۔ اس لئے اس سے بیزار ہیں۔ اور ایک نئی دنیا کے خواب دیکھتے ہیں۔ جہاں سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہو۔ اور جہاں کی زندگی محض تن آسانی کی ایک داستان ہو۔ ایسی دنیا سب سے پہلے افلاطون نے (جو مشرقی تخیلات کا مورث اول ہے) تیار کی تھی۔ اس کے "نظریۂ مُثُل" کا حاصل یہ ہے۔ کہ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں۔ ایک اور دنیا کا جو اس سے بدرجہا زیادہ مکمل اور دلآویز ہے۔ دھندلا سا خاکا ہے حسن حقیقت اور انصاف جو اس دنیا میں ایک ادھوری صورت میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں اپنی اصلی حقیقت میں جلوہ گر ہیں۔ اور جو تکالیف روح کو جستجوئے حقیقت میں یہاں پیش آتی ہیں۔ وہاں وہ ان سب سے آزاد ہے۔ افلاطون نے

اپنی تصانیف میں اس موہوم سی دنیا کا اپنی پوری شاعرانہ قوت سے نقشہ کھینچا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس زندگی کے ہنگامے سے مخلصی پاکر وہ ایک سکون کی دنیا میں جا پہنچے۔ اور اس کی فضا میں جذب ہو جائے۔ اقبال کی تعلیم افلاطون کی تعلیم کے برعکس ہے۔ وہ اس دنیا کی زندگی کو حقیقت سمجھتا ہے اور اس کے مصائب اور شدائد کو انسان کی قوت اور بصیرت کے اظہار کے لئے ضروری سمجھتا ہے ؎

زتیہ و صیدِ نہنگاں حکایتے آور ——— مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست (پیامِ مشرق)

اقبال نے ٹیگور کی طرح اپنی تعلیم کو مبہم نہیں رکھا۔ بلکہ واضح تریں انداز میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں کہا ہے ع اگر خواہی حیات اندر خطر زی یا ؎

بکیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است ——— سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

اقبال سے پہلے غالب نے بھی سکون و جمود کے تباہ کن تصور کے خلاف احتجاج کیا ہے ؎

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق ——— نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

(۹)

دوسری چیز جس سے اقبال کو قطعی دشمنی ہے۔ وہ گمان و شک ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ کہ سرزمین مشرق مختلف مذاہب کا گہوارہ اور یقین و ایمان کا سرچشمہ ہونے کے باوجود ہر قسم کے شکوک کا منبع رہی ہے۔ اور آج کل تو مغرب کی طرف سے شکوک کا جو سیلاب مشرق پر اُمنڈ آیا ہے۔ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ نئی نئی ایجادات۔ سائنس کی حیرت انگیز معلومات، جنگِ عظیم کی ہولناک واردات۔ سرمایہ و محنت کا جھگڑا اور روس کا سیاسی اور تمدنی انقلاب ان شکوک کے اسباب میں سے ہیں۔ حالات کی رفتار اس قدر تیز ہو چکی ہے کہ ہمیں ان پر پوری طرح غور کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ البتہ ہمارے پچھلے خیالات ضرور تہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ آج کل مغرب میں خدا۔ روح۔ مادہ حکومت۔ دولت۔ ازدواج وغیرہ کسی چیز کے متعلق بھی کوئی عام عقیدہ قائم نہیں ہے۔ پچھلے عقائد فنا ہو چکے ہیں۔ یا ہو رہے ہیں۔ اور اُن کی جگہ نئے عقائد قائم ہوتے نظر نہیں آتے۔ ڈیکارٹ دورِ حاضر کا اولین فلسفی شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے فلسفے کی ابتدا یوں ہوئی کہ اسے اپنے وجود پر شک پیدا ہوا مجھے ایسے لوگوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ جو اپنی ہستی کے منکر ہیں۔ میں اپنے ایک ہندو دوست کو جو اپنی بود و نبود میں شک رکھتے ہیں۔ آج تک اُن کی ہستی کا یقین نہیں دلا سکا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ تحصیلِ علم کے لئے شکوک کا ہونا لازم ہے۔ مگر یہ شکوک اگر مادّی دنیا تک محدود رہیں۔ تو مفید ہو سکتے ہیں یعنی انسان اُن کی وجہ سے مادّی حقائق کی تحقیق کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اگر یہ شکوک اس غیر مادّی دنیا تک پہنچ

جائیں جس کا تعلق مذہب کے اصولوں سے ہے تو سوائے اس کے کہ ان سے اور شکوک پیدا ہوں اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ شکوک صرف انہی چیزوں کے متعلق ہونے چاہئیں جن کے متعلق رفع بھی ہو سکیں۔ جیسے مادی حقائق مثلاً اگر کسی شخص کو ستاروں کے متعلق کسی شک کو رفع کرنا ہو۔ تو وہ دوربین کی مدد سے ایسا کر سکتا ہے۔ مگر خدا کی ہستی کے متعلق جو شکوک بھی ہونگے وہ دوربین یا کسی اور ذریعۂ تحقیق کے احاطۂ امداد سے باہر ہونگے۔

مزید برآں علم زندگی کی انتہا نہیں عمل کا درجہ اس سے بالا تر ہے یعنی انسانوں کی اجتماعی زندگی میں کسی واقعہ کا پیدا کرنا بہتر ہے کسی واقعہ کے متعلق تحقیق کرنے سے۔ اقبال نے علم و عمل اور شک و یقین کے باہمی تعلق کو کیا خوب بیان کیا ہے ؎

ہمائے علم تا افتد بدامت ۔۔۔ یقیں کم کن گرفتارِ شکے باش
عمل خواہی یقیں را پختہ تر کن ۔۔۔ یکے جو و یکے بیں و یکے باش

اقبال ہر قسم کے شکوک سے (خصوصاً ان شکوک سے جو حصولِ علم کے لئے مفید ہیں) تنفر سا ہے۔ اس کی ابتدائی نظمیں بھی اس بات کی گواہ ہیں مثلاً ؎

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بیتاب ۔۔۔ پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
آہ وہ حسن زمانے میں کہیں ہے کہ نہیں! ۔۔۔ خاتم دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں

مگر دیکھو یہی اقبال عقل اور یقین کا مقابلہ کس طرح کرتا ہے ؎

بہ پیچ و تابِ خرد گرچہ لذتِ دگر است ۔۔۔ یقینِ سادہ دلاں بہ ز نکتہ ہائے دقیق

پھر کہا ہے اور کس جوش و خروش سے کہا ہے ؎

من آں علم و فراست باپر کاہے نمی گیرم ۔۔۔ کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

اقبال کا بار بار یہی تقاضا ہے کہ ہم عقلی شکوک سے نجات حاصل کر کے یقین پیدا کریں۔ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ عناصرِ زندگی کی تسخیر کرے۔ اور عقلی شکوک ہمیں کچھ بھی کرنے نہیں دیتے۔

اگر ہم اقبال کو محض فلسفی کی حیثیت سے دیکھیں تو ہمیں برگساں کے فلسفے کی طرح اس کے فلسفے کی بنا بھی غیر عقلی نظر آئے گی۔ خدا۔ روح۔ مادہ وغیرہ کی نسبت اقبال کا جواب بھی وہی ہے جو جرمنی کے سب سے بڑے فلسفی امانوئل کانٹ کا تھا۔ یعنی یہ کہ عقل ان کے متعلق کسی قسم کا قطعی فیصلہ دینے سے قاصر ہے۔ نہ ہم خدا کی ہستی کو عقلی وجوہ سے ثابت کر سکتے ہیں نہ عقلی دلائل سے اس کا انکار کر سکتے ہیں۔ مگر اس کی ہستی کے متعلق یقین رکھنا ہماری دنیاوی زندگی کو کامیاب بنانے کے

لئے ضروری ہے۔ اور یہی حال زندگی کے تمام اہم ترین مسائل کا ہے۔ قرآن شریف میں ایک آیت ہے کہ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ یعنی لوگ تجھ سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو کہدے کہ روح میرے خدا کے حکم سے ہے۔ اور فقط۔ رسولِ کریمؐ نے بھی ایسے ایسے دور از کار مسائل کے متعلق سوچتے رہنے سے منع کیا ہے۔ حقیقت میں کامیاب زندگی وہی ہے جس کی بنیاد یقین اور ایمان پر ہو۔ جہادِ زندگانی میں مردوں کی شمشیریں یہی ہیں۔ صوفیا اکثر "عین حقیقت" کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ حقیقت وہی ہے جس پر ہمارا ایمان ہو۔ حوّا کے کسی فرزند نے آج تک حقیقت کو بے نقاب نہیں دیکھا ؎

کہ چوں جلوہ در آئی حجابِ من نظر است

دنیا کا سب سے بڑا عارف خود کہہ گیا ہے کہ "مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ" "ہم نے تجھے ویسے نہیں پہچانا، جیسے پہچاننا چاہئے تھا۔

(۱۰)

اقبالؔ غلامی کا دشمن ہے خواہ وہ ذہنی غلامی ہو یا تمدنی غلامی، یا سیاسی غلامی، اقبال لفظ "مسلم" کو "مردِ آزاد" کا ہم معنی سمجھتا ہے۔ اور یہی اس لفظ کا صحیح مفہوم ہے۔ اسلام ہی دنیا کا ایک ایسا مذہب اور ایک ایسی تحریک ہے جس نے دنیا کو غلامی سے آزاد کرایا ہے۔ اس نے بت پرستی کی مخالفت کی اور بنی نوعِ انسان کی نگاہ کو محسوسات کے محدود حلقے سے بلند کر دیا۔ اُس نے قیصر و کسریٰ کے جور و استبداد کا خاتمہ کر کے انسان کی سیاسی غلامی کو مٹایا۔ زکوٰۃ دینے کا سبق سکھا کر سرمایہ داری (جو استعمار اور جوع الارض کی ماں ہے) کا مقابلہ کیا۔ خدا کے سامنے سب کو ایک کر دیا۔ عورتوں کے حقوق (جن کی اسلام سے پہلے کوئی ہستی نہ تھی) مقرر کئے حتّٰی کہ ان کو جائداد کی ملکیت کا حق بھی دے دیا۔ جو لوگ جسمانی طور پر غلام تھے اُن کے مالکوں کو اُن کے ساتھ برابری کا سلوک کرنے کا حکم دیا اور ان کو آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ اسلام غلامی کا ہر حیثیت سے دشمن ہے۔ مسلمان وہی ہے جس کا دل، دماغ، روح اور جسم آزاد ہو۔ ایک خدا کی پرستش کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی ماسوا سے بے نیاز ہو جائے ؎

ہر کہ پیماں با ہوالموجود بست
گردنش از بندِ ہر معبود رست (رموزِ بیخودی)

(۱۱)

اقبال یاس، حزن اور خوف کا دشمن ہے۔ یہ تینوں چیزیں آج کل ہوا اور پانی سے بھی زیادہ، عام ہیں۔ اور مشرق

ومغرب کی تہذیب کا حصہ بن چکی ہیں۔ اگر آپ کسی مسلمان سے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق گفتگو کریں اور پوچھیں "کہ کیا ان کی حالت کبھی بہتر ہوگی؟" تو ۹۰ فیصدی جواب نفی میں ملیں گے۔ اور یہ اس لئے نہیں کہ ان لوگوں نے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ یا خدانخواستہ انہیں زندگی کا کچھ تجربہ ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ طبعًا مایوس واقع ہوئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو چھوڑیئے۔ اگر آپ آج دنیا کے کسی گوشہ میں یہ سوال کریں کہ زندگی اچھی ہے یا موت۔ تو عام رائے موت کے حق میں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل تمام دنیا میں خودکشی ایک عام چیز ہے۔ اقبال یاس کا دشمن ہے کیونکہ یاس زندگی کی مخالف ہے اور امید زندگی کا سہارا ؎

چراغِ راہِ حیات است جلوۂ امید

یاس انسانی روح کا ایک مرض ہے۔ یہ مرض ہر ایک روح کو کبھی کبھی لاحق ہوا کرتا ہے۔ مگر وہ روحیں جو طبعًا تندرست ہوں اس کے اثر میں دیر تک نہیں رہتیں۔ اگر یہی سوال کہ زندگی بہتر ہے یا موت گوئٹے یا سعدی یا سولہویں صدی کے مشہور بت تراش بن ونوٹو سلینی سے کیا جاتا۔ تو گوئٹے خاموش رہتا۔ شیخ سعدی کھلکھلا کر ہنس دیتے۔ اور سلینی تو یقینًا سوال کرنے والے کا کچومر نکال دیتا۔

یاس کی طرح حزن اور خوف بھی افراد اور اقوام کے لئے بہت بڑی بیماریاں ہیں۔ یہ قوتِ عمل کو تباہ کرتی ہیں اور روح کو کمزور کر دیتی ہیں۔ اقبال نے ان میں سے ہر ایک کو ام الخبائث کہا ہے۔ اور ان کا علاج بھی بتایا ہے جو ان سب کا واحد علاج ہے، توحید پر ایمان۔

(۱۲)

اقبال مادیت کا دشمن ہے۔ زندگی کے واقعات کو سطحی نظر سے دیکھنا۔ سائنس کے معلومات کے علاوہ اور سب حقائق کو نظر انداز کر دینا۔ اور جسمانی آرام و آسائش پر قانع ہو جانا مادہ پرستی ہے۔ میں نے ایک دفعہ پوچھا کہ ابلیس کیا چیز ہے تو اقبال نے جواب دیا کہ ابلیس مادیت ہے۔ اور انسان کے ساتھ اس کی ازلی جنگ ہے۔ مادیت کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی روح کے اعلیٰ مقاصد کو نظر انداز کر دے۔ اور انسانی روح یہ چاہتی ہے کہ مادیت کو تسخیر کر کے اس سے بلند ہو جائے۔ اقبال مادہ پرستی کا دشمن ہے۔ اور اسی لئے تہذیبِ مغرب کا بھی کیونکہ تہذیبِ مغرب محض مادہ پرستی کا دوسرا نام ہے۔ اقبال نے مغرب میں جا کر اس تہذیب کا اپنی آنکھوں سے بغور معائنہ کیا اور اس خودغرضی، تنگ نظری، سنگدلی اور لہو و لعب کو دیکھ کر جو سرمایہ داری کے اصول اور اس تمدن کے بنیادی پتھر ہیں یہ رائے قائم کی ہے۔ کہ ؎

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ۔۔۔ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اقبال جرمنی کے مشہور محقق آسوالڈ سپنگلر کی طرح اس تہذیب کے خاتمہ کا منتظر ہے۔ مگر دونوں کے نقطۂ نظر میں فرق ہے۔ سپنگلر کا نظریہ ہے کہ ہر تہذیب اور تمدّن کی مثال ایک درخت کی سی ہے۔ جس طرح درخت کے لئے اُگنا بڑھنا پھولنا پھلنا اور آخر میں خشک ہو کر گر پڑنا لازم ہے۔ اسی طرح ہر ایک تہذیب اور تمدّن کے لئے ابتدا، عروج تنزل اور خاتمہ لابدی ہے۔ سپنگلر کا خیال ہے کہ مغرب کی موجودہ تہذیب کے عروج کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اور اب اس کا دورِ تنزل اسے خاتمے کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اور یہ سب تقدیر کے اٹل اصولوں کے ماتحت ہو رہا ہے۔ برعکس اس کے اقبال کے کلام کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سپنگلر کے خیال سے متفق نہیں۔ اقبال کا اعتقاد ہے کہ ایسی تہذیب جس کی بنیاد اسلام کے اصول ہوں کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ تہذیبِ مغرب کی بنیاد چونکہ صرف عقل اور عقل کی خام کاریوں پر ہے اور اس کی عظمت کی عمارت نوعِ انسان کے گوشت اور خون سے بنی ہوتی ہے۔ اس لئے اقبال کے نزدیک اسے بقا نہیں ہو سکتی اور وہ اس کے خاتمے کا منتظر ہے۔

(۱۴)

ایک اور چیز جو دورِ حاضر سے مخصوص ہے ملت سے فرد کی بے پروائی اور علیحدگی ہے۔ آج کل ہر انسان علیحدگی چاہتا ہے۔ عورتیں اپنی اقتصادی آزادی سے متاثر ہو کر اور روحانی آزادی کا نام لے کر سب پابندیاں توڑنا چاہتی ہیں۔ مرد بظاہر کشت و خون سے بیزار ہو کر اور ایک بین الاقوامی صلح کا نام لے کر اور باطن میں جدوجہد اور سعیِ پیہم سے تھک کر سوسائٹی سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔ مشرق میں تو صوفیوں۔ درویشوں۔ رشیوں اور مہاتماؤں کی مہربانی سے جو فرداً فرداً اپنی اپنی روح کی خیر مناتے دنیا سے چلے گئے۔ سوسائٹی کا صحیح تخیل جو اسلام نے پیش کیا تھا۔ قائم نہیں رہ سکا۔ مگر مغرب میں بھی اب یہ وبا زندگی کی اندرونی گہرائیوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس وقت تک حالات اس وبا پر قابو پاتے رہے ہیں جنگِ عظیم میں مختلف قوموں کو اپنا اندرونی نظم و نسق مضبوط کرنے کی ضرورت ہوئی تھی۔ جنگ کے بعد یہ نظم و نسق بگڑ گیا۔ مگر روس کے سیاسی اور تمدنی خطرے کی وجہ سے اب پھر سنبھل گیا ہے۔ مگر مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ زمانۂ موجودہ میں انسانی طبائع کا اصلی میلان علیحدگی کی طرف ہے۔ اگر بولشوزم کے پروگرام پر ایک نظر ڈالی جائے تو ان کا بھی منتہائے نظر قریب قریب یہی نظر آئے گا۔ بولشویکوں کے اپنے قول کے مطابق اُن کے مختارانِ مطلق یعنی ڈکٹیٹروں کی حکومت صرف اس وقت تک ہے جب تک دنیا مجموعی حیثیت سے اُن کے خیالات سے متاثر نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ہر قسم کی حکومت اور ہر قسم کے آئین کا دور ختم ہو جائے گا اور امید کی جاتی ہے کہ انسان اپنی فطرت پر اور دوسرے انسانوں کی فطرت پر

اعتماد کر لیا کرے گا۔ ایسا زمانہ آئے یا نہ آئے۔ کم از کم اقبال اُس کے آنے کے خلاف ضرور ہے۔ اُس کے خیال کے مطابق فرد کا ملت سے وابستہ رہنا لازم ہے۔ اقبال کسی فرد من حیث الفرد کی روحانی یا سیاسی نجات کا قائل نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسولِ عربی کو ہر زمانے کے اور ہر قسم کے پیغمبروں پر اسی لئے فضیلت ہے کہ اور سب قیامت کے دن نفسی نفسی کہیں گے مگر آپ کی زبان پر "امتی امتی" ہوگا۔

(۱۴)

اب میں اقبال کے پیغام کی طرف توجہ کرنا چاہتا ہوں مگر قبل اس کے کہ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کے مضمون پر غور کیا جائے بہتر ہوگا کہ دو تین باتوں کو اچھی طرح مدنظر رکھا جائے۔ کیونکہ ان کے بغیر اقبال کا سمجھنا ناممکن ہے

اول۔ اقبال کے لئے زندگی ایک اچھی چیز ہے۔

دوم۔ یہ دنیا اور اس کے رنج والم انسانی روح کی ترقی کے لئے بہت سود مند ہیں۔

سوم۔ زندگی عمل کا نام ہے۔

چہارم۔ زندگی کے لئے تین چیزیں لازم ہیں۔ آرزو۔ کوشش اور امید اور تینوں کی تینوں نہایت ضروری ہیں

اقبال کا پیغام تمام وکمال اسرار و رموز میں محفوظ ہے۔ ان دونوں مثنویوں کی اشاعت کے بعد اقبال نے جو کچھ لکھا ہے اسی پیغام کو دہرانے کے لئے لکھا ہے۔ اور اسے ہزاروں ہی طرح دہرایا ہے۔ اس پیغام کے دو حصے ہیں ایک تو اس سوال کا جواب ہے کہ فرد کو خود کیا ہونا چاہئے۔ اور دوسرا اس سوال کا جواب کہ فرد کی ملت کی طرف کیا ذمہ داریاں ہیں۔

(۱۵)

اقبال فرد کے لئے استحکام خودی چاہتا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان خودنگر، خود شناس اور خودگر ہو۔ تمام کائنات اور کائنات کے تمام اجزا کا وجود خودی ہی کی وجہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک چیز کو دوسری چیز سے تمیز کر لیتے ہیں۔ ایک درخت ہمیں ایک پتھر سے مختلف نظر آتا ہے۔ بلکہ ہم ایک پتھر کو کسی دوسرے پتھر سے بھی تمیز کر لیتے ہیں۔ یہ خودی کی ادنیٰ صورت ہے۔ جب خودی زندگی کے مختلف طبقوں سے گذر کر انسان کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ تو اس کا وجود مکمل ہو جاتا ہے۔ انسان میں پہنچ کر خودی سمندر کی لہروں سے زیادہ بے قرار اور آگ کے شعلوں سے زیادہ بیتاب ہو جاتی ہے ؎

سوزد، افروزد، کشد، میرد، دمد   خیزد، انگیزد، پرد، تابد، رمد

خودی ہی کے دم سے زندگی اور زندگی کی قوتِ تسخیر ہے۔ خودی کے معنے ہیں۔ اپنی فطرت پر برقرار رہنا اور اپنی ہستی کو مکمل کرنا جس کسی نے خودی کے اس سبق پر عمل کیا اُس نے گویا اپنے آپ میں تسخیر کی قوت پیدا کر لی۔ اقبال نے اس حقیقت کو

چاند زمین اور سورج کی مثال سے واضح کیا ہے۔ زمین کی ہستی چاند سے زیادہ محکم ہے، سو چاند زمین کے تابع ہے۔ اور اس کے گرد گھومتا ہے۔ سورج کی ہستی زمین سے زیادہ محکم ہے۔ سو زمین اس کے تابع ہے اور اس کے گرد گھومتی ہے ؎

چوں زمیں بر ہستیٔ خود محکم است ۔۔۔ ماہ پابند طواف پیہم است
ہستیٔ مہر از زمیں محکم تر است ۔۔۔ پس زمیں مسحور چشم خاور است

خودی کے معنے سمجھنے کے بعد یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ ہم اس قیمتی چیز کو ضائع بھی کر سکتے ہیں اور برقرار بھی رکھ سکتے ہیں۔ اس کا برقرار رکھنا حقیقی زندگی ہے اور اس کا ضائع کر دینا موت کے مرادف۔

خودی کی برقراری کے لئے مقاصد کا ہونا ضروری ہے۔ اور مقاصد لپست نہیں ہونے چاہئیں۔ اقبال نے ہر جگہ بلند نظری پر زور دیا ہے۔ مثلاً "طلوع اسلام" میں کہا ہے ؎

ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے ۔۔۔ پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی

یا "زبور عجم" میں مقاصد کے لاانتہا ہونے کا پیغام دیا ہے ؎

زمنزل دل بمیرد گرچہ باشد منزل ماہے ۔۔۔ ز جوئے کہکشاں بگذر، زنیل آسماں بگذر

خودی عشق و محبت سے مضبوط ہوتی ہے۔ اور سوال یا دوسروں کی دست نگری سے ضعیف ہو جاتی ہے عشق و محبت کسی ایسی ہستی کے ساتھ ہونا چاہئے جو دنیا بھر کے انسانوں سے پاک تر، اور محبوب تر ہو۔ ایسی ہستی رسول کریمؐ کی ہستی ہے جو ہزاروں جہانوں کے لئے مایۂ رحمت اور دوست و دشمن کے لئے مرجع و ماوٰی ہے ؎

آنکہ بر اعدا در رحمت کشاد ۔۔۔ مکہ را پیغام لا تثریب داد
طور موجے از غبار خانہ اش ۔۔۔ کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
روز محشر اعتبار ماست او ۔۔۔ در جہاں ہم پردہ دار ماست او

خودی جب عشق و محبت سے محکم ہو جائے تو دنیا کی ظاہری اور باطنی قوتیں اس کے تابع ہو جاتی ہیں۔ ایک فقیر بے مایہ کے سامنے بڑے بڑے دبدبے والے سلاطین کانپ جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی زندگی اس حقیقت کو بڑی اچھی طرح واضح کرتی ہے۔ اگر ان کے زمانے میں فارس اور روم اور شام اور مصر تسخیر ہوئے۔ تو اس کی وجہ کیا تھی؟ محض ان کا عشق نبی ؎

ہر کہ عشق مصطفیٰؐ سامان اوست ۔۔۔ بحر و بر در گوشۂ دامان اوست

خودی کو اپنے استقرار و استحکام میں حیات ملی کے ساتھ وابستہ رہنے سے بہت مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ حیات ملی کے قیام اور تسلسل کا بھی یہی ذریعہ ہے کہ ملت اپنی مخصوص روایات کو محفوظ رکھے۔ اقبال نے ان روایات کی حفاظت پر

اتنا زور دیا ہے کہ ایک شیخ کی زبان سے ایک برہمن کو کہلوا دیا ہے کہ بتوں سے بیزار نہ ہو۔ اور اپنے بڑوں کے طریقوں کو ہاتھ سے نہ دے ؎

من نگویم از بتاں بیزار شو — کافری، شائستۂ زنار شو

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن — پشت پا بر مسلکِ آبا مزن

گر ز جمعیت حیاتِ ملت است — کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

خودی جب مضبوط اور محکم ہو جائے تو اس کی تربیت ضروری ہے۔ اس کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ اطاعت ہے یعنی آئینِ الٰہی کی پابندی۔ آئینِ الٰہی کا مطلب اسلام کے قوانین سے ہے۔ اور یہ قوانین سخت نہیں ہیں۔ اقبال نے اس حالت کو اونٹ سے تشبیہ دی ہے۔ کیونکہ اونٹ ایک محنت شعار اور بوجھ اٹھانے والا جانور ہے۔ دوسرا درجہ ضبطِ نفس ہے یعنی یہ کہ اسلامی قوانین کی پابندی کے ذریعے سے انسان اپنے آپ پر قابو پالے اور ہر ایک قسم کے جسمانی اور روحانی مصائب کے امتحان میں پورا اترنے کے قابل ہو جائے۔ جب یہ ہو جائے تو اس سے آگے تربیتِ خودی کا تیسرا درجہ ہے یعنی نیابتِ الٰہی۔ نیابتِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان زمین پر صحیح معنوں میں خداوند تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ بن کر رہے۔ اس حالت میں انسان "انسانِ کامل" کی حد پر پہنچ جاتا ہے۔ یا نیٹشا کی زبان میں "مافوق الانسان" بن جاتا ہے۔ مگر جیسا کہ میں آگے چل کر ظاہر کروں گا۔ اقبال کے "انسانِ کامل" اور نیٹشا کے "مافوق الانسان" میں بہت فرق ہے۔ اقبال کا "انسانِ کامل" یا دوسرے الفاظ میں مردِ مسلم ہی گویا ہی نوعِ انسان کے وجود کی غرض و غایت ہے ؎

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی

وقت ایک تلوار ہے۔ اور یہ تلوار "انسانِ کامل" یا مردِ مسلم کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مسلم کا فرض ہے کہ وہ آئینِ الٰہی یعنی اسلام کی اشاعت کرے۔ اشاعت ہر ایک ممکن طریق سے ہونی چاہئے۔ جہاد بھی اشاعت کا ایک طریقہ ہے۔ مگر جہاد کی تہ میں ملک گیری کی ہوس ہو تو وہ جہاد جہاد نہیں ہے۔ خود غرضی کی جنگ ہے۔ اور یہ حرام ہے۔ اقبال نے اس خود غرضی کی جنگ کو جو میکیاویلی فلسفے کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ بہت برا کہا ہے۔ اور ضمناً میکیاویلی کی بھی خبر لی ہے کیونکہ آج کل دنیا میں جتنی مصیبتیں ہیں اُن میں سے اسّی فی صدی کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار افراد یا غالب اقوام اسی فلسفے پر عامل ہیں۔

ایک اور شخص جو اقبال کی ملامت کا نشانہ بنا ہے۔ افلاطون ہے جس کے خواب آور فلسفے کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ میرے نزدیک افلاطون دُنیا کے بہت بڑے مجرموں میں سے ہے۔ کیونکہ اس کی تعلیم کا لب لباب نفیِ خودی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ خودی کی تباہی کا سبق اقوام غالب اقوام مغلوب کو دیا کرتی ہیں۔ جیسے مشنری لوگ جو خود حکمران قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان یا اور غلام ملکوں میں جا کر عیسائیت کے تباہ کن اصولوں کی اشاعت کرتے ہیں اور اپنے ملکوں میں نہیں کرتے۔ مگر اقبال کو اس خیال سے اختلاف ہے۔ وہ نیٹشا کے اس خیال سے متفق ہے۔ کہ نفی خودی کا سبق مغلوب قومیں غالب قوموں کو کمزور کرنے کے لئے دیا کرتی ہیں۔ چونکہ مردانہ اوصاف مثلاً جوش عمل ۔غیرت۔ حمیت قربانی ان میں خود موجود نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ ان اوصاف کو دوسری قوموں کے ہاں بھی دیکھنا نہیں چاہتیں۔

(۱۶)

یہاں تک تو خودی کا سبق تھا۔ اب اقبال کے پیغام کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ فرد کو لازم ہے کہ اپنی خودی کی تکمیل اور تربیت کرے۔ لیکن فرد اگر صرف خودی کی حدود کے اندر رہے تو اس کی زندگی کامیاب نہیں ہوتی۔ فرد کا رابطہ ملت کے ساتھ نہایت ضروری ہے۔ اس کا وقار، اس کی عظمت، اس کا احترام ملت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ملت کا تعلق فرد کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک رکھتا ہے۔ کیونکہ ملی روایات کا اثر بہت صحت بخش ہوتا ہے چنانچہ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ شیطان جماعت سے دور رہتا ہے۔ یہاں ہم خودی کی منزل سے گذر کر بے خودی کی منزل میں آپہنچتے ہیں ؎

در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گلبرگے چمن گردد خودی
فرد می گیرد ز ملت احترام ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

افراد کے ایک سلسلے میں منسلک ہو جانے کا نام ملت ہے۔ انسان طبعًا مدنی یا مجلسی واقع ہوا ہے مگر اس مجلسیت سے ملت پیدا نہیں ہوتی۔ ملت کا پیدا ہونا کسی عظیم الشان شخصیت کے اثر کا نتیجہ ہوا کرتا ہے جو ذرّوں کو اٹھا کر آفتاب کر دے اور خاک کو اکسیر بنا دے۔ یہ شخصیت نبیؐ کی شخصیت ہے۔ ایک صاحب دل چند لوگوں کو افراد سے قوم بنا دیتا ہے اور اُن کی نظر کو ایک نصب العین پر قائم کر دیتا ہے تاکہ وہ آوارگی سے آزاد ہو کر اپنے مدعائے حقیقی کی طرف متوجہ ہوں ؎

بندہا از پا کشاید بندہ را از خداوندان رہاید بندہ را
گویدش تو بندۂ دیگر نۂ زیں بتان بے زباں کمتر نۂ
تا سوئے یک مدعایش می کشد حلقۂ آئیں بپایش می کشد

ہر ایک ملت کے لئے اساسی اصولوں کا ہونا ضروری ہے۔ ملت اسلامیہ دو اصولوں پر قائم ہے۔ توحید اور رسالت

توحید انسان کو ماسوا سے بے نیاز کر دیتی ہے ۔ یاس ۔ حزن اور خوف کا جو سب روحانی امراض کی جڑ ہیں قلع وقمع کر دیتی ہے ۔ اور رسالت کا مقصد انسان کو حریت ۔ مساوات اور اخوت کے راستے پر چلانا ہے ۔ جب رسول عربیؐ کا ظہور ہوا تو دنیا بھر پر ذہنی روحانی اور سیاسی غلامی چھائی ہوئی تھی ۔ رسالت نے دنیا کو توہمات اور کفر وشرک سے آزاد کرایا بندہ وآقا کا فرق مٹا دیا ۔ انسان کو انسان کا بھائی بنا دیا ۔ بتوں کو توڑ ڈالا ۔ گویا انسانی روح کو انسانی استبداد سے آزاد کر کے آئین الٰہیہ کا تابع بنا دیا ۔ مساواتِ اسلامیہ کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت عمرؓ اپنے زمانۂ خلافت میں شام کو تشریف لے گئے ہیں تو اُن کے اونٹ کی سواری میں دو اور آدمیوں کا بھی حصّہ تھا ۔ جن میں سے ایک ان کا اپنا غلام تھا ۔ باری باری ہر ایک آدمی سوار ہوتا اور باقی دونوں پیادہ چلتے ۔ حریت اسلامیہ کی سب سے بڑی مثال حادثہ کربلا ہے ۔ امام حسینؓ کی شہادت نے نہ صرف یہ واضح کیا کہ مسلمانوں کا خلیفہ مسلمانوں کا انتخاب کردہ ہونا چاہئے اور نام ونسب کو اس انتخاب میں کچھ دخل نہیں ہونا چاہئے ۔ بلکہ دنیا کو اچھی طرح جتا دیا کہ ایک مسلمان فسق وفجور اور استبداد کی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتا اور یہ عین اسلام ہے ۔ خواجہ معین الدین اجمیری نے کہا ہے ؎

سر داد و نداد دست در دست یزید   حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

اقبال کہتا ہے کہ ؎

رمزِ قرآں از حسین آموختیم   ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت   سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز   تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

حریت ۔ اخوت ۔ مساوات اور توحید انسان کو ماسوا سے بیگانہ اور بلند کر دیتی ہیں ۔ اور چونکہ توحید ورسالت کا مقصد بنی نوع انسان کو ایک برادری میں منسلک کر دینا ہے ۔ اس لئے ملتِ اسلامیہ کے لئے "وطنیت" کا مکانی تصور کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۔ ملت اسلامیہ نہ وطن کی مکانی قید میں ہے ۔ نہ عروج وزوال کی زمانی قید میں ۔ حقیقت چونکہ ہمیشہ کے لئے حقیقت ہے اس لئے ملت اسلامیہ کو فنا ناممکن ہے ؎

از اجل ایں قوم بے پروا ستے   استوار از نحن نزلنا ستے
ذکر قائم از قیامِ ذاکر است   از دوامِ او دوامِ ذاکر است

حیاتِ ملیہ کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد آئین پر ہو ۔ ملتِ اسلامیہ کے نظام کے لئے قرآن شریف آئین کا سرچشمہ ہے ۔ ان آئین پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لئے ہر ایک فرد کی سیرت ملی یا اس کا قوم سے رابطہ

مضبوط ہوتا ہے اور اطوار وآداب محمدیہ کی پیروی کرنے سے ملت کے افراد کے درمیان حسن سلوک بڑھتا ہے۔ فرد کو قوم سے رابطہ مضبوط رکھنا چاہئے خصوصاً جب قوم پر انحطاط کا دور ہو تو اپنی مخصوص روایات کی پوری حفاظت کرنی چاہئے کیونکہ اگر کوئی قوم اپنے انحطاط کے زمانے میں اپنی جمعیت قائم رکھ سکے تو اس کے دن بہت جلد پھر جاتے ہیں۔ اور اگر اس کی جمعیت پریشان ہو جائے تو پھر قوم کا خدا حافظ۔ گویا اقبال نے مسلمانوں کو صاف طور پر یہ جتلا دیا ہے کہ آج کل جب تم پر تنزل کا زمانہ ہے اگر یہودیوں کی طرح اپنے آبا کی روایات کو برقرار رکھو گے تو تمہاری ہستی برقرار رہے گی اور اگر اپنی اپنی جگہ اجتہاد کی ٹھانو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔

حیات ملیہ کے لئے ایک مرکز محسوس ضروری ہے۔ اور ملت اسلامیہ کے لئے یہ مرکز کعبہ ہے۔ کعبہ مسلمانوں کی پرستش کے لئے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ رب کے سب اس کے ذریعے سے جمع ہو سکیں اور ان میں یگانگت پیدا ہو۔ اقبال نے کعبہ کو جسم انسانی سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح جسم انسانی زندگی کا ایک مرکز محسوس ہے۔ اسی طرح کعبہ ملت اسلامی کی زندگی کا ایک محسوس نشان ہے۔ کعبے کا تعلق ملت کی ظاہری جمعیت سے ہے حقیقی جمعیت اسی طرح حاصل ہوتی ہے کہ ملی نصب العین کو جو رسالت کا پیش کردہ ہے ملت کے پیش نظر رکھا جائے اور اس نصب العین کے لئے ملت کی تمام قوتیں وقف کر دی جائیں۔ ملت اسلامیہ کا نصب العین توحید کی اشاعت ہے۔ توحید کی اشاعت ہر مسلمان کا فرض ہے کیونکہ اس سے حیات ملی محکم ہوتی ہے۔ اور ملت ماسوا سے جنگ کرنے کے قابل بنتی ہے۔ مسلمان صرف توحید کے سامنے جھکتا ہے ماسوا اس کی تسخیر کے لئے ہیں۔ مادہ سے جنگ کرنا یعنی سائنس کی معلومات اور تحقیقات میں اضافہ کی کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے عجم کے صوفی عیسائیوں کے ولی۔ بدھ مذہب کے بھکشو ہندوؤں کے رشی سب ماسوا سے الگ رہتے تھے کیونکہ وہ اس سے خائف تھے۔ اقبال دنیا کو ترک کرنا نہیں سکھاتا۔ بلکہ وہ کہتا ہے۔ کہ دنیا میں رہو۔ دنیا کے حالات سے اور فطرت کی قوتوں سے جنگ کرو تا کہ تمہیں اپنی قوتیں آزمانے کا موقع ملے۔ اور تمہاری قوتیں اس استعمال سے زیادہ تیز ہو جائیں

جب حیات ملی اس درجہ محکم ہو جاتی ہے تو گویا ملت میں فرد کی طرح خودی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ خودی کی ابتدا فرد میں ہے۔ اور انتہا ملت میں۔ ملت میں خودی کا احساس اسی صورت میں پیدا ہوتا اور قائم رہتا ہے جب اس کی روایات محفوظ رکھی جائیں۔ روایات کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ قوم کی مائیں ہیں۔ ماں کا بچہ سے اس قدر گہرا تعلق ہوتا ہے کہ ماں اسے جو چاہے بنا سکتی ہے۔ قوم کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری در اصل ماؤں پر ہے اور یہ ذمہ داری دنیا کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

حافظِ رمزِ اخوت مادراں　　　قوتِ قرآن و ملت مادراں

عورت کی جو حیثیت ماں ہونے کے سبب سے ہے۔ وہ اور سب حیثیتوں سے بالاتر اور پاک تر ہے۔ قوم کو ضرورت اس بات کی ہے کہ عورتیں قوم کے لئے غیور اور حق پرست فرزند پیدا کریں۔ یہی ایک عورت کی فضیلت ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا فخر ہے سیدة النسا حضرت فاطمہؓ کو دنیا کی عورتوں پر اسی وجہ سے فوقیت ہے کہ اُن کے فرزند حسنؓ اور حسینؓ تھے۔ اقبال نے مسلمان عورت کو کس جوش سے مخاطب کیا ہے ؎

آب بندِ نخلِ جمعیت توئی　　　حافظِ سرمایۂ ملت توئی

از سرِ سود و زیاں سودا مزن　　　گام جز بر جادۂ آبا مزن

ہوشیار از دستبردِ روزگار　　　گیر فرزندانِ خود را در کنار

(۱۷)

رموزِ بے خودی یہاں پر ختم ہو جاتی ہے شاید کوئی کہے کہ ان دونوں مثنویوں میں اقبال نے فرد و ملت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس کی تہ میں فلسفہ ہے۔ کیونکہ ایک خاص نقطہ نظر سے ہر چیز فلسفیانہ حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اسرار و رموز جس صورت میں اقبال کے قلم سے نکلی ہے۔ وہ فلسفیانہ نہیں کہلا سکتی۔ ایسا آتشیں انداز فلسفے کا نہیں ہوا کرتا۔ اقبال نے یہ نہیں کہا کہ سائنس کا مطالعہ اچھا ہے۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ سائنس کا مطالعہ کرو۔ یہ نہیں کہا کہ جوشِ عمل سے انسانی زندگی کامیاب بنتی ہے۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ جوشِ عمل پیدا کرو اور اپنی زندگی کو کامیاب بناؤ۔

اقبال کے پیغام کا لب لباب کیا ہے؟ اقبال ہر ایک فرد سے یہ کہتا ہے کہ اُٹھ ہوشیار ہو یقین پیدا کر۔ میدانِ عمل میں آ۔ اپنے آپ کو ملت کے ساتھ وابستہ کر۔ اور ملی نصب العین کے لئے سب کچھ قربان کر دے۔ ماسوا سے بے نیاز ہو جا۔ اور ایک ان دیکھے خدا کے ساتھ اپنا رشتۂ الفت جوڑ لے

عاشقی توحید را بر دل زدن
وانگہے خود را بہ ہر مشکل زدن　　(زبورِ عجم)

ممتاز حسن

بلبل

بہار کر چکی ہے وا درِ طلسمِ رنگ و بو
مچل رہی ہے سینۂ چمن میں خواہشِ نمو

تڑپ رہی ہے موجِ مے کھنک رہے ہیں جامِ زر
مہک رہی ہیں خود فروش بوئے گل سے دشت و در

لچک رہی ہیں ڈالیاں ترانہ ریز ہے صبا
طیور صحنِ باغ میں چہک رہے ہیں جابجا

کیا ہی زینتوں کا عزم روحِ لالہ زار نے
نقاب الٹ دیا ہے یا عروسِ نوبہار نے

زمانہ سازگار ہے ہجومِ کیف و رنگ ہے
دلوں میں انبساط کی ترنگ ہے امنگ ہے

مگر ہے عندلیب ان لطافتوں سے بے خبر
سنا رہی ہے غم کے راگ شاخِ گل پہ بیٹھ کر

ہوا کی عطر بیز رَو اگرچہ نرم و سرد ہے
نفس میں اسکے آگ ہے نوا میں اسکی درد ہے

سُن اے ضیائے محفلِ بہار، مطربِ چمن!
جہانِ آب و خاک ہے مقامِ کلفت و محن

چمن خموش، مطمئن ضمیرِ کوہسار ہے
ترا کوئی انیس ہے نہ کوئی غمگسار ہے

گلوں کا خندۂ حسیں اداشناسِ غم نہیں
تری فسردگی کا درد انہیں تری قسم نہیں

کوئی نفس گراں نہیں، نسیمِ عطر بار پر
کوئی شکن عیاں نہیں، جبینِ لالہ زار پر

طیور کیا سمجھ سکیں ترانۂ حزیں ترا
یہ دردِ جاں گسل ترا، یہ سوزِ آتشیں ترا

اِنہیں کسی کی کاوشِ نہاں سے کچھ غرض نہیں
یہ اپنی دُھن میں مست ہیں ابھی یہاں ابھی کہیں

مگر مری نگاہ میں ترے الم کا راز ہے
مری حیات غم کا اک فسانۂ دراز ہے

زمانہ صبر آزما ستم، سدا کئے گیا
دلِ شکستہ پر نئی نئی جفا کئے گیا

مرے دلِ حزیں کو بھی کہیں خوشی ملی نہیں
چمن ہزار بار کھلے، یہ اک کلی کھلی نہیں

تجھے شرابِ عشق نے خراب و خوار کر دیا
مجھے گدازِ روح نے تباہ و زار کر دیا

چل اس فضا کو چھوڑ دیں یہ بہرِ آشیاں نہیں
محبّتوں کے درد کا زمانہ قدرداں نہیں

علی اختر
(از حیدر آباد)

عشق شادی اور ادائے فرض

جاپان کے زنانہ رسالے ان مسائل پر کس طرح بحث کرتے ہیں

زنانہ رسائل میں جنہوں نے موجودہ جاپان کی ضروریات میں ایک اہم جگہ حاصل کر لی ہے ملک کے معاشرتی فلسفی آج کل شادی اور عشق کے دلچسپ موضوع پر بحث کر رہے ہیں۔ اس بحث سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مغربی اصول اور خیالات کو اخذ کرنے میں انہوں نے کہاں تک ترقی کی ہے۔ اگرچہ وہ مانتے ہیں کہ معاشقے کی شادی نہایت خوشگوار ہوتی ہے تاہم ابھی وہ سوچ رہے ہیں کہ ایسی شادی کا انجام بھی خوشگوار ہوتا ہے یا نہیں۔ مغربی یا اینگلو سیکسن اقوام خواہ اس کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھیں کہ معاشقے کی شادی عام رسمی شادی کی بہ نسبت موجودہ معاشرت کی ایک بہتر ایجاد ہے لیکن جاپان میں جہاں ایسے معاملات پر بحث مباحثہ نسبتہً ایک نئی بات ہے اور جہاں نوجوان نسل نے معاشقے کی شادی کے خیال کا خیر مقدم نہایت مشتاقانہ انداز میں کیا ہے وہاں اس امر کے لئے وجوہ پیدا ہو گئی ہیں کہ اس مسئلے کی طرف واقعات کو پیش نظر رکھ کر زیادہ سنجیدگی سے توجہ کی جائے۔

چنانچہ مسٹر ناکامورا نے جاپان کے ایک مشہور زنانہ رسالے "فوجن کلب" میں ایک مضمون شائع کرایا ہے جس کے آغاز ہی میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ "ہر شخص اسی سے شادی کرے گا جسے وہ پسند کرتا ہو، اسی کو اپنا شریک زندگی بنائے گا جس سے اُس کو محبت ہو، بجائے اس کے کہ وہ ایک اجنبی سے اپنا رشتہ جوڑے جسے اُس نے کبھی نہ دیکھا ہو۔ جدید رجحان کی حمایت میں یہ ایک مختصر فقرہ کہنے کے بعد وہ ازدواجی زندگی میں محبت کے متعلق اس عظیم تبدیلی کا ذکر کرتے ہیں جو قدیم خیالات میں واقع ہوئی ہے"؛ اور اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ جاپان کے نزدیک محبت کا مفہوم ابھی مغربی دنیا سے کس قدر مختلف ہے۔

"جب میں یہ کہتا ہوں کہ معاشقے کی شادی رسمی شادی سے قابلِ ترجیح ہے تو میں اُس وقت شادی کرنے والوں کی صرف جذباتی حالت کو بیان کرتا ہوں لیکن ازدواجی زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار ہونے کا انحصار افراد کے شادی کے وقت کے جذبات پر نہیں ہے۔ یہ استدلال صحیح نہیں کہ شادی کرنے والے چونکہ شادی کے موقع پر خوش ہیں اس لئے ہمیشہ خوش رہیں گے۔"

پھر وہ نہایت سادگی اور آزادی سے کسی جذبے کو اہمیت دیئے بغیر لکھتے ہیں :-

"اول تو عشق ایسی چیز نہیں جو دیر تک قائم رہ سکے ۔ وہ محبت جو ماں باپ اور بچوں میں ہوتی ہے جو بھائیوں اور دوستوں میں ہوتی ہے البتہ دیر تک رہتی ہے ۔ لیکن عشق کا معاملہ دوسرا ہے ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ جو ایک وقت ایک دوسرے کے لئے جان تک دے دینے پر آمادہ تھے اُن کا عشق پانچ سات سال سے زیادہ نہ رہ سکا ۔ جذباتِ عشق بعض اوقات انسان پر انتہائی شدید حملہ کرتے ہیں ۔ لیکن یہ عارضی بات ہوتی ہے ۔ ایک سال ، دو سال ، تین سال ، زیادہ سے زیادہ پانچ سال ۔ دو انسانوں کو پہلے پہل ایک دوسرے سے کتنی والہیت کیوں نہ ہو جب وقت گذرتا ہے تو ان کا عشق سرد پڑ جاتا ہے مگر اُن کی ازدواجی زندگی ختم نہیں ہو جاتی ۔ اس لئے ازدواجی زندگی کی تعمیر کسی ایسے جذبے کی بنا پر کرنا جو باقی رہنے والا نہ ہو غلطی ہے ۔ میں ان لوگوں کو بھی غلطی پر سمجھتا ہوں جو آج کل جاپان میں عشق کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں ۔

عشق وہ چیز ہے جو ہم سب کی زندگیوں پر حکومت کرتی ہے ، میں اس کی عظمت اور اہمیت کو جانتا ہوں ۔ یہ ایک سمندر کی موج ہے جو اپنے سامنے ہر چیز کو بہالے جاتی ہے ۔ لیکن ایک اور قوت ہے جو اس سے بھی زیادہ طاقتور ہے ـــ زندگی ! یعنی زندگی کی حقیقتیں ! عشق ایک خوبصورت قوس قزح کی طرح ہے جو عورت اور مرد کے درمیان ایک پل بناتی ہے ۔ اس قوس قزح کی خوبصورتی مردوں اور عورتوں کی آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر دیتی ہے ، اور خواہ وہ اجنبی ہوں انہیں کھینچ کھینچ کر ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہے ۔ جب ایک مرد اور ایک عورت اکٹھے ہو جاتے ہیں تو قوس قزح کا کام ختم ہو جاتا ہے ۔ یہ گم ہو جاتی ہے ۔ اس کے بعد صرف زندگی کی حقیقتیں باقی رہ جاتی ہیں ۔ . . . . ازدواجی زندگی کوئی خواب یا کوئی خیال نہیں ۔ یہ ایک حد درجہ حقیقی شے ہے ۔ وہ شخص جو ازدواجی زندگی کو عشق کی طرح ایک خوبصورت قوس قزح سمجھتا ہے جب اس کو غور سے دیکھے گا تو اُسے ضرور مایوس ہونا پڑے گا ۔

"مرد بھی اور عورتیں بھی سب شادی سے پہلے اپنی ازدواجی زندگی کی تصویر نہایت دل خوش کن کھینچتے ہیں ۔ وہ عشقیہ زندگی اور ازدواجی زندگی کو خلط ملط کر دیتے ہیں ۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو غیر شادی شدہ لوگ عام طور پر کرتے ہیں ۔ یہ ایک خطرناک خام خیالی ہے ، کیونکہ اس کا نتیجہ مایوسی اور ناکامی کے سوائے کچھ نہیں ہے ۔ دو تین سال کے بعد ناگزیر طور پر اُن کی زندگی میں ردِ عمل شروع ہو جاتا ہے ، اور اپنی ناکامی اور مایوسی کو دور کرنے کے لئے وہ نئی نئی ولولہ انگیزیوں اور طوفان خیزیوں میں غرق ہو جاتے ہیں ، جس سے اُن کو اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔"

مسٹر ناکا مورا تسلیم کرتے ہیں کہ بعض اوقات بعض خوش قسمت لوگوں کی عشقیہ زندگی اور ازدواجی زندگی یکساں

ہوتی ہے۔ لیکن یہ صورت شاذو نادر کہیں نظر آتی ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں :۔

"وہ لوگ جو اپنی ازدواجی زندگی میں اپنی عشقیہ زندگی کے خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتے ہیں قسمت سے اپنے حصے سے کچھ زیادہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عشقیہ زندگی کا معاملہ عشق اور صرف عشق ہی سے پڑتا ہے۔ ازدواجی زندگی اتنی سیدھی اور آسان نہیں ہے۔ اس میں سینکڑوں پیچ وخم ہیں، ہزاروں تکلیفیں ہیں۔ عشق کی زندگی کی ابتدا وانتہا ایک مرد اور ایک عورت کے باہمی تعلقات ہیں، لیکن ازدواجی زندگی ایک شوہر اور ایک بیوی کے باہمی تعلقات پر ختم نہیں ہوجاتی، بلکہ وہاں خاندان اور اس خاندان کے ساری دنیا کے ساتھ تعلقات کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ یہ باتیں نہایت پیچیدہ اور تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ درحقیقت ازدواجی زندگی ایک کارِ عظیم ہے جس کی تکمیل دو مختلف النوع کردار مل کر کرتے ہیں۔ ایک مجرد مرد کامل انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا، اور نہ ایک مجرد عورت اس کی مستحق ہوسکتی ہے۔ ان کی تکمیل کے لئے ایک کامیاب ازدواجی زندگی کی ضرورت ہے۔ اسی لئے جب کبھی ہم کوئی ایسا جوڑا دیکھتے ہیں جس کی شادی ہوئے تیس یا چالیس سال گذر گئے ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہم نے دو کامل انسانوں کی زیارت کی ہے۔ ہمیں انسانیت کا حسن وجمال اُن پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔

"لیکن اس کارِ عظیم، اس مہم کی تکمیل کوئی آسان کام نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ ایک سخت اور رخاردار منزل ہے جس کا سفر مشکلات سے بھرا پڑا ہے کیونکہ دو خودمختار اور آزاد ہستیوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرکے ایک بنا دینا کوئی معمولی سی بات نہیں۔ مزید برآں یہ کوئی دلخوش کن تجربہ نہیں ہے۔

"میرے خیال میں ازدواجی زندگی عیش وآرام کا نام نہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہم انسانوں کے لئے یہ ایک تربیت گاہ ہے، تلخیوں، امتحانوں اور مصیبتوں سے بھری ہوئی۔ اور جب ایک مرد اور ایک عورت ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے جادۂ زندگی کی تکلیفیں، پریشانیاں اور تلخیاں اٹھاتے ہوئے گذرتے ہیں تو وہ اُس واحد انسانِ کامل کی تعمیر میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو ان کا مقصدِ حیات ہے۔ میرے خیال میں ازدواجی زندگی کے یہ معنی ہیں"۔

تقریباً ایسے ہی خیالات ٹوکیو کے ایک بلند پایہ نسوانی رسالے "شوفو نوٹوموٗ" نے بھی ظاہر کئے ہیں۔ اس میں وہ نصیحتیں درج ہیں جو والدین نے شادی کرتے وقت اپنے بچوں کو کیں۔ امیر البحر ٹوگو کی بیٹی مادام اوکاڈا لکھتی ہے :۔

"آج کل کے نئے لوگوں کو یہ پرانی وضع کی بے معنی باتیں معلوم ہونگی جنہیں ترقی یافتہ زمانے کی ہوا تک نہیں لگی، کیونکہ ہماری نئی خاتونیں ذاتی آزادی کی پرستار ہیں۔ اُنہیں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ وہ میرے باپ کی نصیحت کو ایک پرانے فیشن کی بڑ سمجھ کر ہنس دیں، لیکن میرے لئے معاملہ بالکل

برعکس تھا۔ میرے کامیاب بوڑھے باپ کی نصیحت اپنی بیٹی کے لئے یہ تھی کہ جب تم بیاہی گئیں تو تمہارے شوہر کا گھر تمہارا گھر ہوگا۔ تمہیں اس گھر کی بہتری کے لئے اپنی انتہائی کوششیں صرف کردینی چاہئیں۔ کچھ بھی ہوجائے تم اس گھر کو پیٹھ نہ دکھانا — کبھی یہاں واپس نہ آنا"

ایک اور مثال لیجئے۔ مادام توارا سابق وزیر وکٹ سوکی کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ ٹوکیو کے اسی رسالے میں وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ:-

"میرا باپ ایک بے زبان سا آدمی ہے۔ اُس نے مجھ سے کبھی زیادہ باتیں نہیں کیں۔ میری شادی کے دنوں میں وہ اپنا وزارتِ مالیات کا منصب دوسرے کابینہ کے حوالے کرچکا تھا۔ اُس وقت ایک بڑی سیاسی سٹرائک مچی ہوئی تھی۔ وہ سخت مصروف تھا، اس لئے شاذونادر ہی کبھی گھر پر زیادہ دیر تک رہتا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس نے شادی کے موقع پر مجھے کوئی خاص بات نصیحت کے طور پر کہی ہو، مگر ماں نے مجھے ایک بات کہی اور بار بار کہی۔ اُس نے کہا 'بیٹی، دوسروں کی مدد سے مستغنی ہوکر رہنا، کسی کا آسرا نہ ڈھونڈنا۔ تمہیں اس چھوٹی سی ابتدا سے ایک بڑا انجام تعمیر کرنا ہے'۔

"اس وقت میرا خاوند محکمۂ مالیات میں محض ایک معمولی ملازم تھا۔ اسی لئے شاید میری ماں نے ضروری سمجھا کہ میں اقتصادی اور ذہنی دونوں حیثیتوں سے استغنا کو اپنی فطرت بناؤں۔ اُس وقت سے اب تک میری ماں کے یہ الفاظ گویا لکھے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اور جب تک ہماری حالت کافی بہتر نہیں ہوگئی میں نے عیش وعشرت کی دلکش آواز پر کبھی کان نہیں دھرے — کوئی تماشا کوئی ناٹک دیکھنے نہیں گئی۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ میری ازدواجی زندگی کے سالہاسال کی مسرت صرف نتیجہ ہے میری ماں کی اس نصیحت کا جس پر میں ہمیشہ سختی سے کاربند رہی"

ایک زیادہ جدید مثال عدالت عالیہ کے چیف جسٹس یوکوٹا کی اکلوتی بیٹی مادام تاجیرو کی ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

"میں ۱۹۲۰ء میں پیرس سکول سے فارغ التحصیل ہوکر نکلی، اور اسی سال جون کے مہینے میں میں نے تاجیرو سے شادی کی۔ اپنے شوہر کو میں شادی سے کئی سال پہلے سے جانتی تھی۔ وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا اور نئے فیشن کے مطابق جس کا حلقۂ اثر روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے ہمیں آپس میں ملنے جلنے کی آزادی حاصل تھی۔ والد اور والدہ دونوں کے خیالات اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق جدید تھے، اور انہوں نے ہماری تربیت کو ہماری اپنی فطرت پر چھوڑ دیا تھا اور ہمیں کافی آزادی حاصل تھی انہوں نے شادی کے موقع پر مجھے صرف ایک نصیحت کی اور وہ یہ تھی کہ شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے پر کامل اعتماد ہونا چاہئے؛ میرے والدین کا یہ ایک فطرتی جذبہ تھا کیونکہ انہیں تاجیرو پر کامل اعتماد تھا۔ سکول چھوڑتے

ہی ناجیرو کا تقرر دفتر خارجہ میں ہوگیا - پھر بہت جلد اُسے باہر جانے کا حکم ہؤا - اور جب ہم ایک اجنبی ملک میں جا کر رہنے لگے اُس وقت مجھے اپنے والدین کی نصیحت کی قدر وقیمت معلوم ہوئی - میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ کسی بیوی کے لئے اس خیال سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خوشی نہیں کہ اُس کے شوہر کو اُس پر پورا اعتبار اور اُس کی وفاداری پر کامل بھروسا ہے - زندگی کی کوئی خوشی اس خوشی کا مقابلہ نہیں کرسکتی -

"یہ وہ بات ہے جو مشرق ومغرب میں یکساں طور پر راحت ومسرت کی ضامن ہوسکتی ہے -

"بمبئی کرانیکل" **منصور احمد**

جو اس بات سے ڈرتا ہے کہ کوئی اس کا دشمن نہ ہو جائے اُس کا کوئی سچا دوست نہیں بنتا -

---

جھوٹے دوست ہمارے سائے کی طرح ہیں کہ روشنی میں ہمارے ساتھ ساتھ ہیں لیکن جہاں ہم تاریکی میں گئے وہ غائب ہوئے -

---

اگر ہم اپنے دوستوں سے دیر تک جدا رہیں تو انہیں بھول جاتے ہیں اور اگر ہم دن رات اُن کے ساتھ رہیں تو انہیں حقیر جاننے لگتے ہیں -

---

دوست سے باتیں کرنا گویا اونچی آواز سے سوچنا ہے -

دوست کو علیحدگی میں جھڑک لو لیکن اوروں کے سامنے اُس کی تعریف ہی کرو -

---

دو کہ دیا ہؤا روپیہ جاتا بھی رہے گا تو دوست پھر بھی تمہارا دوست ہے لیکن ادھار دو تو تمہارا دوست جاتا رہے گا بالفرض محال اگر تمہارا روپیہ واپس بھی مل جائے -

---

جیتے جی ہمیں کسی دوست سے لطف نہیں ملتا ملنا اگر ہمارا ہوگا تو قبر کے اُس پار ہی - دوست مرتا ہے تو ہماری روح کو وہ کتنا اپنے ہمراہ لے جاتا ہے - ہم اس کے ساتھ گویا نصف مرجاتے ہیں -

گلچیں

نواہائے راز

جس رُخ پہ نظر ڈالی تصویر تری پائی
جس لب سے صدا نکلی تقریر تری پائی

ہر برگ کو ہر گل کو مکتوب ترا جانا
لوحِ دل وجاں پر بھی تحریر تری پائی

کس طرح رہا ہوں میں اس قید سے اے مالک
جب ہر بنِ مُو پر اک زنجیر تری پائی

ٹوٹے ہوئے دل سے بھی الفت نہ گئی تیری
ہر ایک خرابے میں تعمیر تری پائی

اب میری خطاؤں سے اغماض نہ کر آقا
الطاف سے شیریں تر تعزیر تری پائی

تقدیر کو کیا روئیں تدبیر کو کیا پیٹیں
تقدیر تری دیکھی تدبیر تری پائی

ہم رہ سے بھٹک سکتے اتنی بھی نظر کب تھی
جو اپنی خطا دیکھی تقصیر تری پائی

حامد علی خاں

دائمی شباب

پنجابی میں ایک نہایت پُر معنی ضرب المثل ہے جس کا قریب ترین مفہوم یہ ہے

وقت کی نماز، بے وقت کی ٹکریں

عام مطلب تو یہی ہے کہ کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو نماز کو بے وقت ادا کرنا گویا یونہی سر پھوڑنا ہے مگر اس معمولی سی بات کی تہ میں جو راز ہے یہ ہے کہ اگر کوئی وقت پر نماز ادا کرے گا تو قدرۃً کسی مسجد میں **باجماعت** نماز ادا کریگا گویا اصلی نماز میں خدا کی عبادت اس قدر مقصود نہیں جس قدر کہ مسلمانوں کا جمع ہونا اور مل کر کچھ کرنا۔ نماز عشق ہے مگر خدا کا نہیں، ہرگز نہیں، مسلمانوں سے عشق کا نام نماز ہے۔ خدا محض بہانہ ہے۔ کوئی اسے یوں سمجھ لے کہ جو شخص بُرے مسلمان کو بھی بُرا کہے وہ نمازی نہیں، صرف سر پھوڑنے کا عادی ہے۔

کہاں میں کہاں یہ وعظ کی دھن مگر مشکل یہ آپڑی ہے کہ جو مطلب ادا کرنا چاہتا ہوں وہ وعظ ہی کے رنگ میں ادا ہو سکتا ہے جس طرح نماز کا کمال یہ ہے کہ نماز عشق بن جائے چاہے وہ خدا ہی کا عشق ہو اور مسلمانوں سے عشق کے پایۂ کمال کو نہ پہنچے اسی طرح عشق کا کمال یہ ہے کہ وہ نماز بن جائے۔ جس مرد میں اتنا ہوش باقی ہے کہ اپنی معشوقہ کا کوئی عیب اسے نظر آتا ہے وہ مرد عشق سے بے بہرہ ہے۔ خام عشق عشق ہی نہیں محض سر پھوڑنا ہے۔

وقت جو کہ زندگی کا تانا بانا ہے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ عشق کرو تو شباب میں کرو کیونکہ شباب کے بعد یہ تانا بانا رنگ نہیں پکڑتا۔ کہاں بھوسلے رنگ کی خاکستری زندگی اور کہاں وہ ارغوانی شادمانی جو شباب میں عشق کی کامرانیوں کا انعام ہے۔

شباب کا عشق، بڑھاپے کی ٹکریں

یہ عبارت یہاں تک لکھی جا چکی تھی کہ اُس قصے کا خیال آگیا جس میں ایک سائنس دان شیشے کا ایک ایسا گھٹا ٹوپ ایجاد کرتا ہے کہ مرتے وقت اگر اس بلوریں گھٹا ٹوپ کو مرنے والے کے اوپر جما دیا جائے تو روح یا وہ روحانی طاقت جس سے انسان زندہ ہے خود بخود بلوریں گھٹا ٹوپ کے اوپر کے حصہ میں سما کر جو بجلی کے لیمپوں کی طرح کانچ کا بلب ہے، آپ ہی بند ہو جاتی ہے۔ یوں تو نظر کچھ نہیں آتا مگر ایک خاص قسم کی ایکس ریز سے اس بلب کو جو دیکھا جائے تو یہ روح یا طاقت نہایت

خوشنما رنگوں کا مجموعہ ہے اور اس طاقت کی رنگینیوں کی سحرکاریاں کسی حد تک خارج از قیاس ہیں۔ اس ستم ایجاد سائنس دان نے یہاں تک کیا کہ دو روحوں کو ایک ہی بلب میں بند کرکے بھی دیکھا۔ متضاد روحیں تو ایک دوسری کے ساتھ ملتے ہی گویا جل بھن کر خاک ہوگئیں مگر مانوس روحیں اور بھی زیادہ چمکیں۔ جن روحوں میں کچھ قدرتی انس تھا وہ تو ایک دوسری سے مل کر اس طرح شعلہ زن ہوئیں کہ ہیرے موتی پانی پانی ہوں، لعل و زمرد پھیکے پڑیں۔ اس سائنس دان کا مطلب کوئی تماشا قائم کرنا تو نہ تھا صرف یہ دکھانا تھا کہ وہ جادو جس کا نام انسان ہے مرنے پر تلف نہیں ہوتا۔ رہتا ہے اور ایسا رہتا ہے کہ اگر نا اہل سے پالا نہ پڑے تو پہلے سے بہت زیادہ آب و تاب کے ساتھ۔

یہ قصہ یونہی درمیان میں آگیا۔ روحیں اگر رنگین شعلے ہیں تو شباب میں عشق کی برقی رو انہیں اور بھی زیادہ نمایاں کرسکتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ شباب صرف وہ فساد ہے جو محض جسمانی جوانی کا ایک خاصہ ہے یا اس شباب کا کوئی الگ معیار ہے

وقت جو کہ زندگی کا تانا بانا ہے کبھی اپنی بلند آواز کو کسی ایسی چیز کے لئے ضائع نہ کرتا جو ہر ذی روح میں قدرتی طور پر ضائع ہوتی ہے۔ جوانی واقعی ضائع ہوتی رہتی ہے اور اسے ضائع ہونا چاہئے۔

"جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی"

جوانی جا کے نہیں آتی۔ جس شباب کا یہاں ذکر ہے اس کا آنا مشکل ہے مگر آجائے تو پھر کبھی نہیں جاتا۔ جنہیں یہ شباب حاصل نہیں وہ اسے اُس خدا سے طلب کریں جو

دائمی شباب

ہے اور جو اسی لئے ہمہ تن عشق ہے اور جسے اسی لئے کبھی سزا اور جزا کی فرصت ہی نہ ہوگی۔

اس نازک انوکھے مسئلے کو کون سمجھے گا؟ لوگوں میں یہ غلط العام مروج ہے کہ انسان بچہ پیدا ہوتا ہے پھر جوان ہوتا ہے، پھر بوڑھا ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان بے انتہا بوڑھا پیدا ہوتا ہے۔ ماں کے پیٹ کے اندر ہی پہلے چار پانچ مہینے میں اس بیچارے پر ہزارہا قرن گذر جاتے ہیں۔ شکل مچھلی سے بدلتے بدلتے کتے کی طرح بن کر پھر انسانی ڈھانچہ اختیار کرتی ہے۔ کیا صانع ازل ہر مغرور شکاری "بوند" پر اس قدر محنت محض اس لئے صرف کرتا ہے کہ شباب کے بعد بڑھاپا ہو؟ لاحول ولا قوۃ۔ ممکن ہے کہ یہ اُن کے لئے سچ ہو جو صرف جسم کے لئے زندہ ہیں گو مجھے اس میں بھی شک ہے۔

وقت جو کہ زندگی کا تانا بانا ہے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ انسان باقی ذی روح چیزوں سے مختلف ہے۔ بادل کی جڑ سمندر میں ہے پھول کی جڑ زمین میں ہے۔ روشنی کی جڑ تاریکی میں ہے۔ یہ سب چیزیں باہر کی طرف پھولتی پھلتی ہیں مگر انسان کی جڑ ساری دنیا ہے۔ انسان وہ پھول ہے جو اللہ کی طرف کھلتا ہے۔ اس پھول کی خوشبو عشق ہے مگر یہ خوشبو صرف اسی شباب میں ظاہر ہوتی ہے جس کو دوام ہے۔

فلک پیما

ایران سے ایک خط

مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر محمد مجیب صاحب نے ایران سے ایک مفصل خط اپنے ایک عزیز کے نام لکھا ہے اس کے کچھ اقتباسات سید مقبول حسین صاحب کی وساطت سے ہمیں بغرضِ اشاعت موصول ہوئے ہیں۔

ایران میں آج کل ہندوستان سے زیادہ امن و امان ہے۔ بلوچی، ازبیگ، ترکمان، کرد، ایسی قومیں ہیں جن کا پیشہ حضرت آدم کے زمانے سے لے کر ۱۹۲۵ء تک ڈاکہ زنی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ رضا شاہ نے سب کے دماغ درست کر دیئے ہیں، جہاں کہیں جائیے کوئی خوف وخطرہ نہیں ہے۔ خدا کرے یہ حالت قائم رہے جنگل، بیابان، دشت، ہر طرف پولیس اور فوج کے تھانے قائم ہیں، تمام دن تھانے کے اوپر "ممالک محروسۂ ایران" کا جھنڈا (جو ہمارے کانگرس فلیگ کی طرح سہ رنگی یعنی سفید اودے اور سرخ رنگ کا ہے) لہراتا رہتا ہے، شام کو جھنڈے کے اوپر ایک لالٹین ٹانگ دیتے ہیں تاکہ مسافروں کو معلوم ہو جائے کہ آبادی کہاں ہے۔ میں نے ایران کے ہر کونے میں یہ تھانے پائے ہیں۔

فوج اور پولیس کی تعداد ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ ایرانی اپنے آپ کو طبعًا سست اور کاہل سمجھتے ہیں۔ اس سستی کو دور کرنے کے لئے دولت نے قاعدہ بنایا ہے کہ ہر ایرانی کے لئے دو یا تین سال فوج یا پولیس میں کام کرنا فرض ہے۔ پولیس کی وردی سفید اور بہت بھدی ہے۔ فوج کی وردی وہی ہے جو یورپ کی قوموں میں رائج ہے، پہلوی ٹوپی ہر فوجی بلکہ ہر ایرانی کے لئے ضروری ہے۔ میں نے کچھ ایرانیوں سے دریافت کیا کہ تم ایک فرنچ کیپ کو کیوں اپنا ملی لباس سمجھتے ہو ان کا جواب ہے کہ ہم نے اس کو مسلمان اور ایرانی کر ڈالا ہے۔

فوج اور پولیس کے لئے قانوناً حکم ہے کہ کوئی ایسی چیز استعمال نہ کریں جو ایران میں نہ بنی ہو اسلحۂ جنگ اس قاعدے سے مستثنےٰ ہیں۔ حال میں ایک نئے قانون کے ماتحت یورپ سے تمام ان اشیا کا آنا بند کر دیا گیا ہے جو ملی زندگی کے لئے ضروری نہیں ہیں مثلاً "اشیاء برائے زینت چہرہ ولباسِ زناں" پاؤڈر، ریشم کے کپڑے، سگار اور ہر قسم کی شراب جو یورپ میں تیار ہوتی ہو۔ برخلاف اس کے وہ شراب جو ایران میں ایرانی انگوروں سے تیار ہوئی ہو، اس کو یہاں کے باشندے مذہبًا نہیں تو ملتہً جائز سمجھتے ہیں۔ شراب خواری کا چنداں رواج نہیں ہے۔ کچھ لوگ اگر پیتے بھی ہیں تو کم پیتے ہیں۔ میں نے آج تک ایک بھی ایسا ایرانی نہیں دیکھا جو مدہوشی کی حالت میں ہو۔ یورپ کی جو چیزیں بالکل ممنوع نہیں ہیں اُن پر سو فی صدی کا ٹیکس لگایا جاتا

ہے مثلاً اچھا خوشبودار کاغذ (جس پر آپ کو لکھنے کی عادت ہے) اس کا ایران میں لانا ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی لائے تو اس کو مامورین گمرک (چنگی کے عہدہ دار) چھین لیتے ہیں۔ اوسط درجہ کے کاغذ پر ۱۰۰ فیصدی کا ٹیکس ہے۔ برخلاف اس کے ردی کاغذ یعنی وہ کاغذ جو روزمرہ کے استعمال اور کتابوں کے چھاپنے کے لئے ضروری ہے، بغیر ٹیکس دیئے ہوئے آتا ہے اور چنداں گراں نہیں۔ باہر کے سگار، تنباکو، سگریٹ اب یہاں بالکل نہیں آسکتے، ایرانی سگرٹ خراب نہیں ہوتے اور قیمت میں گولڈ فلیک سیزرز وغیرہ سے بہت کم ہیں۔ اچھی قسم کے سگرٹ یہاں نہیں بنتے ہیں۔

گاؤں کی عورتوں کے علاوہ آپ کی تمام ایرانی بہنیں بجز انگریزی فراک اور لمبی جرابوں کے اور کوئی لباس پہننا نہیں جانتیں۔ یہاں تک کہ حاجیوں، مولویوں اور اہل دین کے خاندانوں میں بھی یہی لباس رائج ہے۔ طہران میں کچھ عورتوں نے پردہ چھوڑ دیا ہے۔ اور سگرٹ پیتی ہوئی ہیٹ پہن کر نکلتی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد اب تک کم ہے۔ بالعموم یہاں ایک سیاہ برقع رائج ہے جس کو یہاں کی اصطلاح میں چادر کہتے ہیں۔ یہ بہت بھدا، خوفناک اور کریہہ المنظر ہوتا ہے۔ اگر چادر جسم کو ڈھانپ رکھے تو کافی ہے چہرے کا چھپانا چنداں ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ آنکھیں، ناک اور اوپر کا ہونٹ عام طور پر کھلا رہتا ہے برخلاف ہندوستان کے یہاں شریف گھرانے کی بیبیوں کے لئے مکان کے باہر کام کاج کے لئے جانا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ آج کل ایران میں شاید ہی کوئی عورت ایسی ہو جو ہندی مسلم عورتوں کی طرح تمام زندگی گھر میں نظربند رہی ہو۔ بایں ہمہ کسی معمولی ایرانی مرد کی جرأت نہیں ہوتی کہ طہران کے علاوہ (یہاں یورپ کا اثر کسی قدر زیادہ ہے) کہیں اور اپنی بی بی، ماں یا بہن کے ساتھ سڑک پر گھومے عورتیں ہمیشہ اکیلی چلتی ہیں یا اپنا الگ جھنڈ بناتی ہیں۔ برسر راہ عورتوں اور مردوں میں کبھی گفتگو نہیں ہوتی، الا بضرورت سخت کچھ دن ہوئے کہ ایک ایرانی دوست کے ساتھ تفریح کے لئے مشہد میں نکلا تھا۔ دوسری طرف سے اُن کی خانم نمودار ہوئیں اور سر سے کچھ اشارا کیا۔ بیچارے بہت گھبرائے۔ کیا کرتے۔ نظر زمین کی طرف کی، پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز رفتار سے سڑک کے دوسری طرف گئے اور پھر صرف ایک لفظ کہہ کر واپس بھاگ آئے، بھاگتے وقت سڑک کے دونوں طرف دیکھتے تھے کہ کہیں مجھے کسی دوست یا واقف نے تو نہیں دیکھ لیا۔ امید ہے کہ چار پانچ سال کے بعد یہاں کے مردوں میں زیادہ جرأت و ہمت ہو جائیگی۔

میرا خیال تھا کہ ایرانی مردوں اور عورتوں میں یورپ کا لباس حال میں رائج ہوا ہے، لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ مجھے اکثر ایرانیوں نے یقین دلایا ہے کہ انہوں نے اپنے والدین کو ہمیشہ یورپین لباس میں دیکھا ہے۔ ایک آغا صاحب جن سے مجھے کل ملنے کا اتفاق ہوا کہنے لگے کہ میں پینتیس سال سے یہ لباس پہن رہا ہوں اور میرے ماں باپ نے میری پیدائش سے بیس سال پہلے یہ لباس اختیار کیا تھا۔ غالباً ناصر الدین شاہ قاچار کے زمانہ سے پہلے لباس یورپ کا رواج ہو چلا تھا، اب تو مزدور کاشتکار سب کوٹ اور پتلون ڈانٹتے ہیں۔ کچھ گاؤں کی عورتوں کو بھی میں نے فراک میں دیکھا۔ پرانا ایرانی لباس بالکل مفقود

ہوگیا ہے۔

تعلیم کا ہندوستان کے برابر یہاں چرچا نہیں ہے۔ سائنس و ریاضی وغیرہ میں یہاں کے لوگ ہندوستان کے پایہ کو نہیں پہنچتے، ادبیات سے لوگوں کو زیادہ دلچسپی ہے۔ ایک امریکن کالج ہے اور اچھے طالب علم زیادہ تر وہیں سے نکلتے ہیں۔ کل یا پرسوں اس کو دیکھنے جاؤں گا عورتوں کے لئے بھی اعلیٰ تعلیم صرف یہیں ممکن ہے۔

تہذیب اور اخلاق میں ایرانیوں سے بہتر غالباً کوئی قوم نہیں ہے، جہلا اور دہقان بھی تہذیب سے باتیں کرتے ہیں۔ فحش بکنا، گالی گلوچ، مار پیٹ، یہ فنون یہاں کے باشندوں نے اب تک نہیں سیکھے، گاڑی والے بھی جب بہت پریشان ہو جاتے ہیں تو سوائے "آغا، خانم" بلند آواز میں پکارنے کے اور کوئی الفاظ نہیں استعمال کرتے۔ لکھنؤ میں جتنے بدتہذیبی کے الفاظ ایک دن میں استعمال ہوتے ہیں غالباً تمام ایران میں ایک صدی میں نہیں ہوتے کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ عورتوں کی طرف گھور کر دیکھے۔

یہاں ڈاکٹر ڈھونڈنے پر بھی اکثر نہیں ملتے، وکلاء کا طبقہ صرف دو سال سے وجود میں آیا ہے اور طہران کے سب سے بڑے وکیل کی آمدنی غالباً ہزار بارہ سو روپیہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ اکثر ایرانیوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ موکل کے لئے بہتر ہے کہ محنتانہ کا روپیہ وکیل کو دینے کے بجائے جج کے حوالہ کردے۔ رشوت کا پہلے بہت رواج تھا۔ اب سب شعبوں میں تفتیش ہو رہی ہے اور جو پکڑا جاتا ہے اُس کو بہت سخت سزا دی جاتی ہے لیکن جب تک افسروں کو مناسب تنخواہیں نہ دی جائیں گی رشوت کا کم ہونا مشکل ہے۔

چھوٹے تاجر بہت ہیں لیکن بڑے تاجروں کی تعداد کم ہے۔ دورِ جدید میں بہت ترقی ہو رہی ہے، اور قوم کی اقتصادی حالت روز بروز اچھی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں شہر کی گورنمنٹ کو حکومت، صوبہ کی گورنمنٹ کو ایالت اور مرکزی حکومت کو دولت کہتے ہیں۔ تمام ایران میں صرف پانچ صوبے ہیں: مشہد، طہران، کرمان، کرمان شاہان اور اصفہان۔ مشہد کے والی یا گورنر جنرل کے بارے میں میں نے دریافت کیا: اُن کی تنخواہ صرف ۵۰۰ تومان (ایک ہزار روپیہ ہے) اس پر بعید زمانہ میں ۵۰۱ تومان (۲۲۵ روپیہ) کا اضافہ کیا گیا ہے۔ سپاہی چپراسی وغیرہ کی تنخواہ وہی ہے جو ہندوستان میں ہے۔ سیاسی معاملات میں لوگوں کو بہت کم دلچسپی ہے، سب امور دولت پر چھوڑ دیتے ہیں کوئی مخالفت کی آواز نہ دولت کے خلاف اور نہ طرزِ جدید کے خلاف بلند ہو سکتی ہے، رضا شاہ نے پردے اور عام طرزِ معاشرت میں (بجز پہلوی کیپ کے) لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے لیکن چونکہ افسرانِ اعلیٰ تہذیب یورپ کے دلدادہ ہیں اس لئے کوئی مخالفت نہیں کرتا۔ بایں ہمہ تہذیبِ جدید کے شوقین "تند رفتاری" سے بہت ڈرتے ہیں اور سب تبدیلیاں آہستگی سے ہوتی ہیں۔

میں جس حصہ میں ہو کر آیا ہوں تقریباً تمام ویران ہے۔ اکثر میلوں تک ایک پتی یا جھاڑی نہیں دکھائی دیتی جس دن سے کوئٹہ چھوڑا ہے ایک خودرو درخت نہیں دکھائی دیا، صرف چشموں کے آس پاس پھلوں کے درخت ہوتے ہیں شیشم، برگد، پیپل، نیم کی طرح کے کوئی درخت یہاں نہیں ہیں۔ زمین غالباً اچھی ہے لیکن پانی کی قلت کی وجہ سے بے کار پڑی ہے، فطرت نے ایران کے لئے کچھ نہیں کیا، جو کچھ دکھائی دیتا ہے انسانی کوشش کا نتیجہ ہے۔

موسم یہاں کا منصوری اور نینی تال جیسا ہے۔ لوگوں کی صحت اچھی ہوتی لیکن متعہ کی رسم کی وجہ سے مرض بہت پھیل گیا ہے۔ اکثر شریف خاندان اس میں مبتلا ہیں، اور زیادہ تر مریض ایسے ہیں جن کو یہ بدنصیبی وراثتہً حاصل ہوئی ہے۔ چونکہ موروثی ہے اس لئے اس کا اعتراف بھی برا نہیں سمجھتے: جو نعمت ہر گھرانے میں موجود ہے اُس کو کون بُرا کہے۔ دورِ جدید میں سنا جاتا ہے کہ متعہ کو معیوب سمجھنے لگے ہیں اور یہ رسم کسی قدر کم ہو گئی ہے، لیکن اہلِ دین کا طبقہ اس رسم کا حامی ہے اور دولت نے اب تک اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کی جرأت نہیں کی۔

یہاں تمام اشیا ہندوستان کے مقابلہ میں ارزاں ہیں سوائے اُن چیزوں کے جو یورپ سے آتی ہیں برخلاف اس کے، وہ چیزیں روس سے آتی ہیں وہ بہت سستی ہیں۔ یورپ کے باشندے خاص کر روسی ملک کے ہر حصہ میں ملتے ہیں، ارمنی اور دیگر عیسائی قوموں کی کافی تعداد ہے۔ دورِ پہلوی کے اور کارناموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس نے یورپ کے باشندوں کے دماغ سے گھمنڈ بالکل نکال دیا ہے۔ پہلے کچھ یوروپین تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اُن کو ایران کے قوانین توڑنے کا حق حاصل ہے۔ رضا شاہ نے ایسے چند مجرموں کو سخت سزا دی۔ اب سب ٹھیک ہو گئے ہیں۔ بہت سوچ سمجھ کر قدم رکھتے ہیں۔ ایران سے سونا باہر لے جانا منع ہے۔ حال میں ایک بہت بڑی موٹر کار کمپنی کا مینیجر گرفتار ہوا ہے جس نے سونے کی سلاخیں بنائی تھیں تاکہ موٹر کار کے نیچے لگا کر اُن کو ملک کے باہر لے جا سکے، رضا شاہ کا حکم ہوا ہے کہ یہ ہرگز نہ خیال کیا جائے کہ وہ یوروپین ہے۔ جو قانونی سزا ہے وہ دی جائے۔

محمد حبیب

بادل

(سانیٹ)

چھائے ہوئے ہیں چار طرف پارہ ہائے ابر،
آغوش میں لئے ہوئے دنیائے آب و رنگ،
میرے لئے ہے اُن کی گرج میں سرودِ چنگ،
پیغامِ انبساط ہے مجھ کو صدائے ابر
اُٹھی ہے ہلکے ہلکے سُروں میں نوائے ابر،
اور قطرہ ہائے آب بجاتے ہیں جلترنگ،
گہرائیوں میں روح کی جاگی ہے ہر امنگ،
دل میں اُتر رہے ہیں مرے نغمہ ہائے ابر!

مدّت سے لُٹ چکے تھے تمنا کے بار و برگ،
چھایا ہوا تھا روح پہ گویا سکوتِ مرگ،
چھوٹی ہے آج روح مری اس جمود سے۔
اِن بادلوں سے تازہ ہوئی ہے حیات پھر،
میرے لئے جوان ہے یہ کائنات پھر،
شاداب ہو گیا ہے دل اُن کے سرود سے!

راشد وحیدی

بھولی بات

جوانی کے دنوں میں کسی پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کی، کسی پر مر مٹنے کی خواہش کتنی پیاری اور دل خوش کن معلوم ہوتی ہے! لوگ اسے پاگل پن سمجھتے ہیں، لیکن ایسا کون ہے، جسے اپنی زندگی میں ایک مرتبہ اس کا تجربہ نہ ہوا ہو؟

ایک وہ دن تھا جب کمل نے کہا تھا "تارا! اس زندگی میں کیا تمہاری محبت کی قیمت ادا کر سکوں گا؟ دنیا ہنستی ہے، ہنسنے دو! سوسائٹی گالیاں دیتی ہے، دینے دو! تم میری ہو، میں تمہارا ہوں! یہ بالکل سچ ہے۔ دنیا کی کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ہمیں اور تمہیں الگ کر سکے!"

پریم پیاسی تارا نے مسکرا کر جواب دیا "مجھے تمہارے کہنے کا یقین ہے"

\+ \+ \+ \+ \+ \+ \+

دن گزرنے لگے۔

بہت سکھ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہی رہ جاتے، ایک تھالی میں بیٹھ کر کھانا کھاتے کسی طرح کا آپس میں فرق نہ تھا۔

اُس دن شام کو، کمل تارا کو ساتھ لے کر دل بہلانے کے لئے نکلا تھا۔ بات چیت کرتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا۔ ایک اونچے کراڑے پر چڑھتے ہوئے کمل نے کہا "تارا! یہاں سے گرنے پر ہڈیوں کا پتہ بھی نہیں چل سکتا!"

تارا نے خوفزدہ ہو کر کہا "یہ بہت خوفناک جگہ ہے!"

محبت سے بھرے ہوئے لہجہ میں کمل نے کہا "اگر ہم دونوں ایک دوسرے سے چپٹے ہوئے، کود پڑیں تو......"

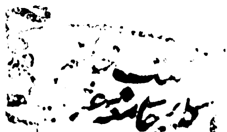
تارا چپ تھی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

"بولو! تم راضی ہو؟"

"تمہارے ساتھ مرنے میں بھی مزا ہے۔ کیا میرا امتحان لینا چاہتے ہو؟"

"نہیں تارا! مجھے خود اپنی طبیعت کے مضبوط ہونے میں شبہ ہے!"

کمل تارا کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک لمحہ کے لئے موت کا خیال بھی بہت اچھا معلوم ہوا!



دونوں گھر کو لوٹے۔ آسمان کی رنگین تصویروں کو جمع کرکے سنہری شام بھی آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی غائب ہوگئی تھی۔

(۲)

سال کے بعد سال آئے اور گئے۔

الجھن کا جال بنا۔ ایسا جال، جس میں پھنس کر انسان معلوم نہیں کہاں سے کہاں چلا جاتا ہے۔

سکھ، پریم اور خوبصورتی سے بھری ہوئی دنیا کو کوئی نفرت کی نظروں سے کیوں دیکھتا ہے؟ پاگل آنکھیں جنہیں دیکھنے کو ترستی رہ جاتی ہیں ـــ وہی آنکھیں۔ ایک دن ایسا آتا ہے۔ جب پلکیں بند کرکے اُن سے دور بھاگنے کی خواہش کرتی ہیں۔

اُس اچھے اور سہانے گانے سے جی بھر جاتا ہے طبیعت اُوب جاتی ہے۔

دنیا کی پوری طاقت جسے چھڑا نہیں سکتی تھی، کمل خود ہی اس بندھن کو توڑ ڈالتا ہے۔ تارا کی جن باتوں پر وہ فدا تھا، اُنہیں سے اب گھبرا اُٹھا۔

بزدل انسان اپنے اوپر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا؛ وہ اپنے ارادوں پر پکا نہیں رہتا؛ وہ اپنے خیالات کا غلام ہوتا ہے۔ کمل بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔

(۳)

شراب کی بے ہوشی سے جیسے اُٹھ کر کوئی رات کی گزری باتوں کو سوچتا ہے، ٹھیک وہی حالت تارا کی تھی۔ آہ! سکھ کتنا مہنگا ہو گیا تھا!

وہ سچی محبت کا دم بھرنے والے خیالات، اب گندی نالیوں میں بہنے لگے۔ کالے دل میں یاد کی ویسی ہی ایک دو لکیریں تھیں، جیسے پرکھنے میں کسوٹی پر سونے کی رہ جاتی ہیں۔

تارا بیٹھی سوچا کرتی تھی۔ دین، دنیا سے وہ ٹھکرائی ہوئی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔ دنیا میں کون کسی کا ہوتا ہے؟

اس کی محبت کے آنگن میں آگ برس پڑی جلن میں بھی لطف ہے، آہ ہے، بےچینی ہے، درد ہے!

گھبراہٹ کی ایک گہری کھائی میں تارا کو اکیلا چھوڑ کر کمل چلا گیا۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس کا پورا بیان کرنا فضول ہوگا؛ کیونکہ تارا ایسی بھٹکنے والی عورتیں اکثر دنیا کی آنکھوں کے سامنے آجایا کرتی ہیں

(۴)

بہت دن گذر گئے۔ معلوم نہیں، کمل کا کیا انجام ہوا۔ اگر وہ زندہ ہوگا، تو اُس کی جوانی ڈھل گئی ہوگی۔

تب سے اب میں کتنا الٹ پلٹ ہوگیا تھا!

تارا بیٹھی ہوئی گھاٹ کے کنارے بھیک مانگ رہی تھی! اور اپنی سنہری جوانی کی باتیں سوچ رہی تھی۔ وہ باتیں آج کیوں یاد آئیں؟ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ اپنے سکھ کے دنوں میں کمل کی گود میں سر رکھ کر، اوپر دیکھتی ہوئی، کمل کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر، وہ اکثر گایا کرتی تھی:-

آنکھوں میں سما جانا،
پلکوں میں رہا کرنا۔
دریا بھی اسی میں ہے،
موجوں میں بہا کرنا۔

آج پیٹ کے لئے، کچھ دانوں کے اکٹھا کرنے کے واسطے وہ گھاٹ پر بیٹھی، یہ گیت گا رہی تھی۔
گاتے گاتے، رک کر وہ سوچنے لگی —— اپنے عیش کے خواب! سامنے اس کے کپڑے کے ٹکڑے پر کچھ چاول اور پیسے پڑے تھے۔

مالا پھول سے سجی ہوئی چاندی کی ڈولچی ہاتھ میں لئے ہوئے ایک ادھیڑ عمر بھگت گنگا نہا کر مندروں میں درشن کرنے جا رہا تھا ٹھٹھک کر اس آدھے گیت کو اپنے من میں سوچنے لگا۔ بھگت راج کی آنکھیں نہ معلوم کیوں بھر آئیں۔ چپ چاپ ایک چوّنی —— ایک گول چاندی کا ٹکڑا —— اسی پھٹے کپڑے پر پھینکتے ہوئے، وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا، مگر بڑھتے ہی راستے میں کھڑی ہوئی ایک گائے سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گیا۔ شاید کوئی 'بھولی بات' سوچنے لگا تھا۔

وہ لوٹ آیا۔ سامنے سے دیکھنے کی ہمّت نہیں ہوئی، کترا کر ایک کونے میں کھڑا ہو کر تارا کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا اور تارا ابھی چوّنی دینے والے کی مہربانی پر غور کر رہی تھی۔ اُس نے دینے والے کی ریشمی چادر تو دیکھ لی تھی، چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھوم کر دیکھنے لگی۔

وہ کتنا ہی چاہتی تھی "بھگوان تمہارا بھلا کریں" مگر اُسے بھی کوئی بھولی بات یاد آگئی۔ اُس نے دعا نہ دی!!

(ترجمہ) کنھیا لال

غزل

اُس نے کہا حسرت ہے کیا؟ میں نے کہا حسرت تری
اُس نے کہا مدِّ نظر؟ میں نے کہا چاہت تری

اُس نے کہا ہے زیست کیا؟ میں نے کہا جلوہ ترا
اُس نے کہا اور موت کیا؟ میں نے کہا فرقت تری

اُس نے کہا عشق و وفا؟ میں نے کہا مسلک مرا
اُس نے کہا جور و جفا؟ میں نے کہا فطرت تری

اُس نے کہا کانٹے ہیں کیا؟ میں نے کہا میری مثال
اُس نے کہا پھر گُل ہے کیا؟ میں نے کہا صورت تری

اُس نے کہا گُل میں ہے کیا؟ میں نے کہا خوشبوئے گل
اُس نے کہا خوشبو میں کیا؟ میں نے کہا نکہت تری

اُس نے کہا فانی ہے کیا؟ میں نے کہا غصّہ ترا
اُس نے کہا جاوید کیا؟ مَیں نے کہا الفت تری

اُس نے کہا دیکھا ہے کیا؟ میں نے کہا اک آئنہ
اُس نے کہا وہ آئنہ؟ مَیں نے کہا صورت تری

اُس نے کہا کیا ہے دعا؟ میں نے کہا عاشق کی خُو
اُس نے کہا اور گالیاں؟ میں نے کہا عادت تری

اُس نے کہا چھُوٹا ہے کیا؟ میں نے کہا میرے کرم
اُس نے کہا بگڑا ہے کیا؟ میں نے کہا نیت تری

اُس نے کہا مرتے ہو کیوں؟ میں نے کہا موت آگئی
اُس نے کہا کیا لے چلے؟ میں نے کہا حسرت تری

اُس نے کہا مطلب ہے کیا؟ میں نے کہا تیری رضا
اُس نے کہا اور مدّعا؟ میں نے کہا خدمت تری

اُس نے کہا تُو کون ہے؟ مَیں نے کہا عاصی ترا
اُس نے کہا کیا چاہئے؟ میں نے کہا رحمت تری

عاصی گیاوی

دشمن کا سُراغ

اُس رات مسٹر اسحاق نہایت شوق سے وائرلس پر گوہر کا گانا سن رہے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے آپ ہی آپ کہا "واقعی یہ گیت اچھا تھا"۔۔۔ دفعتہً باہر سے دو گولیاں چلنے کی دہشتناک آواز آئی اور اُن کے سر کے ادھر والی کھڑکی کے شیشے چور چور ہو کر گر پڑے (جس کمرے میں مسٹر اسحاق بیٹھے تھے وہ مکان کی سب سے نچلی منزل میں تھا)

اُنہوں نے وہی کچھ کیا جو ہم میں سے ہر شخص ایسے موقع پر کرتا ہے یعنی ایک لمحے تک وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھے رہے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یکایک اُن پر خوف طاری ہوا اور انہیں احساس ہوا کہ کسی نے ان پر دو گولیاں چلائی ہیں۔ اُن کے سامنے کے دروازے کی لکڑی چھل گئی تھی اور اُس کے نیچے گولی دھنسی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے خیال کیا کہ گلی میں دوڑ پڑیں اور اس بدمعاش کو گردن سے جا پکڑیں لیکن یہ قاعدہ ہے کہ جوں جوں انسان عمر میں بڑھتا جاتا ہے وہ اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ پہلے ارادے کو ترک کر کے دوسرے پر عمل کرتا ہے چنانچہ مسٹر اسحاق ٹیلیفون کی طرف جھپٹے اور پولیس کو بلایا۔

"ہیلو! کسی کو فوراً بھیجو۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے"

کسی نے نیم خوابیدہ آواز میں پوچھا "لیکن کس جگہ؟"

مسٹر اسحاق نے غصہ سے لال پیلا ہو کر کہا، جیسے پولیس والے اس حملے کو روک سکتے تھے "یہیں میرے مکان پر۔ کس قدر سینہ زوری ہے، ایک بے قصور آدمی پر جو آرام سے اپنے گھر میں بیٹھا ہو اس طرح بلا وجہ گولہ باری شروع کر دی جائے اس کی تفتیش سختی سے کرنی ہوگی یہ خوب ہے کہ۔۔۔"

اسی نیم خوابیدہ آواز نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "بہت اچھا۔ میں کسی کو بھیجتا ہوں"

اضطراب انگیز غصے میں مسٹر اسحاق کے منہ سے جھاگ اُبل رہا تھا۔ انتظار کے یہ لمحات انہیں صدیاں محسوس ہو رہے تھے۔ آخر ایک لمبا تڑنگا کرخت انسپکٹر پولیس پہنچ گیا۔ اور اس نے نہایت غور سے اُس کھڑکی کا معائنہ شروع کر دیا جس میں سے گولیاں آئی تھیں۔

اُس نے نہایت متانت سے کہا "کوئی شخص یہاں گولیاں چلاتا رہا ہے۔"

مسٹر اسحاق نے غصہ سے کہا "یہ تو میں بھی آپ کو بتا سکتا تھا میں یہیں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا!"

انسپکٹر نے ایک چاقو کی مدد سے دروازہ میں سے گولی نکالتے ہوئے کہا "ساتھ نمبر کی گولی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی پرانے فوجی ریوالور سے چلائی گئی ہے۔ دیکھئے نا۔ یہ شیطان جو کوئی بھی تھا، ضرور اُس سامنے کے جنگلے پر کھڑا ہو گا اگر وہ فرش پر کھڑا ہوتا تو گولی ضرور اوراوپر نکل جاتی۔ تو جناب اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو نشانہ بنانا چاہتا تھا!"

مسٹر اسحاق نے تلخی سے کہا "عجیب بات ہے۔ میں سمجھا تھا کہ اُس نے دروازے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے!"

انسپکٹر نے اس دخل درمعقولات کو قابلِ اعتنانہ سمجھتے ہوئے کہا "لیکن وہ تھا کون؟"

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اُس کے ٹھکانے کا صحیح پتہ نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ مجھے اُس کی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا اور ویسے بھی مجھے پوچھنے کا خیال نہیں آیا!"

انسپکٹر نے اسی متانت سے کہا "اس سے تو معاملات اور بھی پیچیدہ ہو گئے اور آپ کا شبہ کس پر ہے؟"

اب مسٹر اسحاق کو صبر کا یارا نہ رہا۔ انہوں نے غصہ سے کہا "حضرت من اول تو میں نے اُس سؤر کو دیکھا نہیں اور اگر وہ اس قدر انتظار کرتا بھی کہ میں کھڑکی میں سے اُسے سلام کر سکتا۔ تب بھی میں اس اندھیرے میں اُسے پہچان نہ سکتا تھا حضور والا اگر میں اُس سے واقف ہوتا تو آپ کو اس وقت زحمت دینے کی ضرورت ہی کیا تھی!"

انسپکٹر نے اطمینان آمیز لہجے میں کہا "ہاں بات تو معقول ہے لیکن شاید آپ سوچ کر کوئی ایسا شخص بتا سکیں جسے آپ کی موت سے فائدہ پہنچنے والا ہو۔ یا جو آپ سے کسی بات کا انتقام لینا چاہتا ہو۔ ورنہ جناب آپ جانتے ہیں کہ یہ چوری کی واردات نہیں ہے۔ کوئی چور گولی نہیں چلاتا جب تک کہ اس کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ کار ہی نہ رہے ممکن ہے یہ کوئی ایسا آدمی ہو جسے آپ کے ساتھ دشمنی ہو۔ اس کا فیصلہ صرف آپ ہی کر سکتے ہیں ـــــ اور پھر ہم اس پر غور کرینگے!"

مسٹر اسحاق حیران سے ہو کر رہ گئے۔ واقعی انہیں ان باتوں کا خیال ہی نہ آیا تھا۔

انہوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "مجھے تو اس بات کا وہم و گمان بھی نہیں" اور اپنی تمام پُرامن اور تنہا زندگی پر ایک نظر دوڑائی "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ یقیناً کوئی نہیں ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے۔ میں نے کبھی کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں کیا۔ میں تو تنہا ہی رہتا ہوں۔ کہیں جاتا آتا بھی نہیں اور نہ دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل دیتا ہوں۔ کسی کو میری دشمنی سے کیا مطلب؟"

انسپکٹر نے کندھوں کو سکوڑتے ہوئے کہا "درست ہوگا لیکن شاید آپ کل تک اس معاملہ پر اچھی طرح روشنی ڈال

سکیں۔ آپ کو یہاں تنہائی میں ڈر تو نہ معلوم ہوگا؟"

مسٹر اسحاق نے ذرا تامل سے کہا "نہیں تو" اور جب وہ اکیلے رہ گئے تو آپ ہی آپ کہنے لگے "عجیب بات ہے۔ میری جان لینے کی کسی کو کیا ضرورت تھی۔ بھلا میں نے جو راہبوں کی سی زندگی بسر کرتا ہوں۔ کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ دفتر جاتا ہوں اور پھر سیدھا گھر آجاتا ہوں۔ میری تو راستے میں بھی کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوتی۔ پھر کسی کے لئے میری جان لینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ لوگوں کے اس غیر منصفانہ رویہ کے متعلق ان کی حیرت بڑھتی جارہی تھی آہستہ آہستہ انہیں اپنی مظلومیت پر رحم آنے لگا۔ "دیکھو! میں ایک گھوڑے کی طرح مسکنت اور مشقت کی زندگی بسر کرتا ہوں۔ دفتر کا کام گھر پر بھی آکر کرتا ہوں، حدودِ شرافت سے کبھی ذرہ بھر بھی تجاوز نہیں کیا۔ کبھی میں نے عیش وعشرت میں قدم نہیں رکھا۔ گھونگے کی طرح اپنے خول میں گھسا رہتا ہوں اور ڈر!! کوئی آتا ہے اور مجھے اپنی گولی کا ہدف بنانا چاہتا ہے۔ لوگ کس قدر شیطان صفت ہیں۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے کسی کو مجھ سے ایسی دیوانہ وار نفرت کیوں ہے؟"

وہ بستر پر بیٹھے تھے۔ پاؤں سے اتارا ہوا بوٹ ابھی اُن کے ہاتھ ہی میں تھا۔ وہ اپنے آپ کو اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہے تھے۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "اس معاملے میں ضرور کوئی مغالطہ ہوا ہے۔ اُس نے مجھے کوئی اور شخص سمجھا ہوگا جس کے ساتھ اس کی دشمنی ہوگی۔ یقیناً یہی بات ہے۔ کیونکہ مجھ سے کسی کو ایسی نفرت ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

مسٹر اسحاق کو یکایک کچھ یاد آگیا اور گھبراہٹ میں اُن کے ہاتھ سے بوٹ گر گیا۔ "ہاں یہ ممکن ہے۔ اس میں میری ہیچ تو تھی لیکن اُس وقت بے ساختہ وہ بات میری زبان سے نکل گئی۔ اُس وقت میں رب نواز سے باتیں کر رہا تھا لیکن نتائج کو سوچے بغیر میرے منہ سے اُس کی بیوی کے متعلق ایک بُری بات نکل گئی تھی۔ گو سب جانتے ہیں کہ وہ بے شرم ہر نتھو خیرے سے آنکھیں لڑاتی پھرتی ہے اور اُس کے شوہر کو بھی اس کا علم ہے لیکن وہ اپنے اس علم کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ اور مجھے دیکھو گدھوں کی طرح بک اُٹھا......

مسٹر اسحاق کو یاد آگیا کہ رب نواز اس وقت کڑوے گھونٹ کی طرح کچھ نگل رہا تھا اور اُس کی انگلیاں غصے سے ہتھیلی میں کھبی جاتی تھیں۔ انہوں نے خوفزدہ آواز سے کہا "الٰہی بچائیو! اُسے سخت صدمہ ہوا تھا۔ ممکن ہے وہ اُس سے دیوانہ وار محبت کرتا ہو یہ درست ہے کہ میں نے صفائی کے لئے بڑی لفاظی سے کام لینا شروع کیا لیکن وہ تو اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس میں اب شبہ کی گنجائش نہیں کہ اُس کے پاس میری دشمنی کی معقول وجہ موجود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ گولیاں اُس نے نہ چلائی ہونگی۔ ایسا خیال کرنا بے وقوفی ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا کرے بھی تو حق بجانب......"

مسٹر اسحاق عجب حیرانی سے زمین کی طرف گھور رہے تھے "ہاں، اور اس درزی کا معاملہ!" انہوں نے بڑی کوشش سے تمام واقعات کو اپنے ذہن میں یکجا کیا "پندرہ سال تک میں اس سے اپنے کپڑے سلواتا رہا اور پھر ایک دن میں نے سنا کہ وہ تپ دق کے تیسرے درجے میں ہے۔ یقیناً ایسے کپڑے پہننے میں ہر انسان کو تامل ہوگا جن میں ایک مدقوق درزی کھانستا رہا ہو، سو میں نے اس سے کپڑے سلوانے بند کر دیئے۔ وہ میرے پاس آیا اور التجائیں کرنے لگا۔ کہتا تھا کہ میرے پاس ایک ٹمانکے تک کا کام نہیں ہے۔ میری بیوی بیمار ہے، اور میں اپنے بچّوں کو کسی دوسری جگہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے بار بار کام مانگتا تھا الٰہی توبہ! بیچارہ مردے کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس کا پسینہ بہتا ہوا دیکھ کر معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کس قدر بیمار ہے۔

"میاں فیض! دیکھو ان باتوں سے کیا فائدہ ۔ میں کسی کاریگر کو کام دینا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے کام سے مطمئن نہیں ہوں"۔

اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا اور شرم اور خوف سے پسینے میں شرابور ہو گیا "حضور آپ کے میں بڑی محنت سے سیوں گا" میں حیران ہوں کہ اس کی چیخیں کیوں نہ نکل گئیں . . . . اور میں ـــــ" مسٹر اسحاق نے ذرا ذہن پر زور دے کر یاد کیا "میں نے اسے مایوس واپس کر دیا۔ میں نے کہا "اچھا میں غور کروں گا" اور ایسے فقروں کا مطلب یہ بیچارے اچھی طرح جانتے ہیں۔ یقیناً یہ شخص میرا دشمن ہو سکتا ہے" مسٹر اسحاق نے خوفزدہ ہو کر کہا "یقیناً یہ بہت بُری بات ہے کہ ایک شخص تو اپنی زندگی کے لئے التجائیں اور منتیں کرے اور دوسرا اسے نہایت بے دردی سے واپس کر دے لیکن اس میں میرا کیا قصور تھا۔ میں تو دیکھ رہا تھا کہ اس میں کام کرنے کی سکت ہی نہیں"۔

مسٹر اسحاق کا دل مغموم تر ہوتا گیا "اور یہ ایک اور ناخوشگوار واقعہ تھا۔ میں نے دفتر کے چپڑاسی کو کس قدر سخت سست کہا۔ دفتر کی ایک فائیل نہ ملتی تھی اور میں نے اس کو بلا کر اس طرح ڈانٹنا اور گالیاں دینا شروع کیں جیسے وہ کوئی سکول کا لڑکا تھا اور پھر دوسروں کی موجودگی میں "اسی طرح تم دفتر کی چیزیں سنبھالتے ہو بدکردار! تم نے دفتر کو مرغیوں کا ڈربہ بنا رکھا ہے۔ میں تمہیں برخاست کر دوں گا" اور پھر وہ فائیل میری اپنی دراز سے نکلی۔ اس بے چارے نے ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا۔ وہ کانپتا رہا اور آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جھپکتا رہا۔

مسٹر اسحاق کے جسم میں گرمی کی ایک لہر دوڑ گئی "لیکن ایک افسر کا اپنے ماتحتوں سے معافی مانگنا بھی تو بھلا معلوم نہیں ہوتا"۔ یہ بات انہوں نے اپنے دل کو تسلّی دینے کے لئے کہی "خواہ میں نے اس پر کسی قدر سختی ہی کی۔ لیکن یہ ماتحت اپنے افسروں سے کس قدر نفرت کرتے ہوں گے۔ - اچھا ٹھہرو۔ میں اسے اپنے کوئی اترے ہوئے کپڑے

دے دوں گا۔ لیکن شاید اس سے وہ اور بھی برا مانے۔"

اب مسٹر اسحاق سے بستر پر لیٹا بھی نہ جاتا تھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پلنگ پوش نے انہیں جکڑ رکھا ہے۔ وہ گھٹنوں کے گرد بانہیں لپیٹ کر بیٹھ گئے اور تاریکی میں گھورنے لگے۔" اور پھر اشفاق احمد والا واقعہ۔ وہ اچھا خاصا تعلیم یافتہ آدمی ہے۔ نظمیں بھی لکھتا ہے۔ لیکن جب اُن کاغذات کے ضمن میں اس سے ایک غلطی ہوگئی تو میں نے کہا "لڑکے! اسے دوبارہ کرو۔" میں کاغذات اس کے میز پر پھینکنا چاہتا تھا لیکن وہ کم بخت اس کے پاؤں میں جا گرے۔ اور جب وہ انہیں اٹھانے کے لئے جھکا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میں اپنا سر پیٹ لینا چاہتا تھا۔ مجھے اس لڑکے سے محبت بھی ہے۔ لیکن میں نے اسے کس قدر بے عزت کیا۔ حالانکہ میری نیت یہ نہ تھی۔

مسٹر اسحاق کے واہمہ نے ایک اور چہرہ پیش نظر کر دیا۔ اور یہ اُن کے دفتر کے رفیقِ کار جلیل احمد کا تھا "بیچارہ جلیل، وہ ہیڈ کلرک بننا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کے بجائے میں مقرر ہوگیا۔ تنخواہ میں چند روپیوں کے اضافے کی بات تھی اور اس بیچارے کے چھ بچے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے بڑے لڑکے کو کالج میں داخل کرانا چاہتا تھا۔ لیکن اب اس کی تنخواہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا الوجود اور نکمے کا اپنا قصور ہے۔ سنا ہے اس کی بیوی نہایت جھگڑالو اور ہڈیوں اور پوست کا ڈھانچا ہی ہے۔ بیچارے دوپہر کو سوکھی روٹی ہی پر گذارا کرتے ہیں۔ بیچارہ جلیل! وہ ضرور خفت محسوس کرتا ہوگا۔ میں باوجود مجرد ہونے کے اس سے زیادہ تنخواہ پاتا ہوں۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟ جب وہ میری طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے تو میں ضرور گھبرا جاتا ہوں۔"

ان پشیمانیوں سے مسٹر اسحاق کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ "ہاں، اور ہوٹل کا وہ ملازم جو میرے چند آنے کے پیسے ہتھیا لینا چاہتا تھا۔ میں نے ہوٹل کے مالک کو بلایا اور اُس نے کھڑے کھڑے اُسے موقوف کر دیا اور کہا "خبیث چور! میں خیال رکھوں گا کہ شہر بھر میں تجھے کوئی ملازمت نہ دے۔" اس شخص نے ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا اور چپکے سے نکل گیا۔ اس کے کندھے، قمیص سے ابھرے ہوئے اب بھی مجھے صاف دکھائی دیتے ہیں۔"

مسٹر اسحاق پھر وائرلیس سٹ کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے آلہ اٹھا کر کانوں سے لگا لیا۔ لیکن وائرلیس سٹ بھی خاموش رات کے ان خاموش لمحات کا ہمنوا تھا۔

مسٹر اسحاق نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور ہر وہ شخص انہیں نظر آنے لگا جس کے ساتھ انہیں دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اور جو انہیں آج سے پہلے کبھی یاد نہ آیا تھا۔

صبح وہ تھانے میں گئے۔ طبیعت مضطرب تھی اور چہرہ زرد تھا۔
انسپکٹر پولیس نے کہا "ہاں جناب تو کیا آپ نے کوئی ایسا آدمی سوچا ہے جسے آپ کے ساتھ دشمنی ہو؟"
مسٹر اسحاق نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "میں نہیں کہہ سکتا۔ اتنے زیادہ لوگ ہیں جن کے متعلق امکان ہے کہ مجھ سے عداوت رکھتے ہونگے کہ ———"، انہوں نے عجب بیچارگی سے اپنے ہاتھ کو حرکت دی "حقیقت تو یہ ہے کہ انسان بتا ہی نہیں سکتا کہ کتنے لوگوں کو اُس نے اذیت دی ہے۔ میں اب اس کھڑکی کے پاس کبھی نہ بیٹھوں گا۔ اور میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اس تمام معاملے کو رفع دفع کر دیا جائے۔"

(ترجمہ) مظفر احمد

سمندر اور اُس کے موتی

سمندر کے پاس موتی ہیں!
اور آسمان کے پاس ستارے!
لیکن میرے دل، آہ، میرے دل کے پاس فقط محبت!!!

سمندر اور آسمان کی سلطنتیں وسیع ہیں!
لیکن میرا دل اِن سے کہیں زیادہ وسیع ہے!!
اور موتیوں اور ستاروں سے میری محبت کہیں زیادہ روشن اور پُر نور ہے!!!

اے ننھی، نوجوان حسینہ! میرے دل کی بے پایاں سلطنت میں سما جا!
میرا دل، سمندر، اور آسمان، محبت کی گرمی سے پگھل رہے ہیں!!

(ہائن رش ہائینے) عظیم قریشی لدھیانوی

شباب

(۱)

ایک گلرو مطربِ رنگیں نوا
ہے فرازِ کوہ پر نغمہ سرا

ساز اس کا کیف سے لبریز ہے
ہر ترانہ اس کا وجد انگیز ہے

کہہ رہا ہے دل کشا انداز میں
یاس کا نغمہ نہیں اس ساز میں

میری قسمت میں نہیں لکھی شکست
آسماں بھی سامنے میرے ہے پست

حلقۂ مہتاب ہے میری رکاب
نامور ہوں، نام ہے میرا شباب

(۲)

ہائے! وہ کالی بلا، تاریک رات
کانپتی ہے جس سے ساری کائنات

ساتھ لائی ابر اور طوفان کو
ہیبت و تخریب کے سامان کو

اک طرف برقِ تپاں کا اضطراب
اک طرف زور آزما تنہا شباب

نام ہلنے کا نہیں لیتا مگر
جیسے پتھر ہو کوئی کہسار پر

کہہ رہا ہے "صبحِ خنداں ہے قریب
چھپ چلی ہے رات کی شکلِ مہیب

خلد میں ہوتا ہے مردوں کا قیام
اوجِ سدرہ پر رقم ہے ان کا نام

ہے نظر میں اُن کی چرخِ ہفتمیں
طائرِ دل اُن کا ہے طوبیٰ نشیں"

(ہیر لڈ بیگ بی)

کلیم

کوکو

گاؤں کے گرد و نواح میں لوکس کسان کا گھر "سوبلی" کے نام سے موسوم تھا۔ کوئی اس کی وجہ تسمیہ نہ جانتا تھا۔ لوگ اس کا نام لیتے وقت صرف مالک کی تونگری اور خوشحالی کو ملحوظ رکھتے تھے اور یہ خاص مکان جسے یہ نام دیا گیا تھا ایک ایسے شخص کی ملکیت تھا جس کی زمین گاؤں کی تمام کھیتیوں سے زیادہ وسیع، زرخیز اور محفوظ تھی۔

اس کا کھیت چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد شاندار اور بلند درختوں کی پانچ قطاریں تھیں جو سیب کے نازک اور بل دار درختوں کو میدانی علاقے کی تیز و تند ہوا سے بچاتی تھیں۔ علاوہ اس کے اندر ایک لمبی عمارت کا سلسلہ تھا جس میں غلے اور گھاس وغیرہ کا ذخیرہ رکھا جاتا تھا۔ سخت اور ناہموار پتھر کے بنے ہوئے اُستھانوں کی ایک قطار تھی جس میں مویشی بندھتے تھے۔ ایک اصطبل تھا جس میں تیس گھوڑے باندھے جا سکتے تھے، اور سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک چھوٹی سی خوبصورت سی کٹیا بھی جو ننھے سے قلعہ کی مانند دکھائی دیتی تھی اس میں شامل تھی۔

وہاں پتھری کھاد کے ڈھیر قرینے سے پڑے رہتے تھے۔ حفاظت کرنے والے کتوں کے لئے تازی خانے بنے ہوئے تھے اور لمبی لمبی گھاس میں لاتعداد مرغ اور دوسرے جانور اڑاتے پھرتے تھے۔

ہر روز کھانے کے وقت گھر کے سب آدمی (جن کی تعداد پندرہ تھی) باورچی خانے کی لمبی میز پر جمع ہوتے تھے جہاں ایک گہری پھولدار رکابی میں پڑے ہوئے گرم گرم شوربے میں سے بھاپ نکلتی دکھائی دیتی تھی۔

تمام جانور ——— گھوڑے، گائیں، سؤر اور بھیڑیں ——— خوب پلے ہوئے اور صاف ستھرے تھے اور اُن کی پرورش بہت عمدہ طریقے سے کی جاتی تھی۔ لوکس جو ایک مضبوط اور معمر آدمی تھا یہ دیکھنے کے لئے کہ ہر چیز معمول کے مطابق درست ہے یا نہیں ہر روز تین مرتبہ اپنی جاگیر میں گشت کیا کرتا تھا۔

ایک بہت بوڑھا سفید گھوڑا جس پر اس کے مالکوں کی خاص شفقت تھی اصطبل سے بہت دور بندھا رہتا تھا۔ اس کی مالکہ اس کی زندگی کے اختتام تک اسے آرام میں رکھنا چاہتی تھی کیونکہ اس غریب جانور نے کسی زمانے میں کئی موقعوں پر اس کی رفاقت کی تھی۔ ایک چھوٹا سا شریر لڑکا جس کا نام "ازاڈور ڈوول" تھا اور جسے لوگ اختصار کے طور پر "زیڈور" کہتے تھے اس کمزور جانور کی حفاظت اور نگہداشت کے لئے ملازم رکھا گیا تھا۔ زیڈور کا صرف یہ کام تھا کہ موسم سرما میں اسے

دانہ کھلائے اور اُس کے بستر کا انتظام کرے۔ اور موسم گرما میں ہر روز چار مرتبہ چراگاہ میں جا کر اس کو ایک میخ سے کھول کر دوسری میخ سے باندھے تاکہ اسے کثرت کے ساتھ تازہ اور اچھی گھاس مل سکے۔

یہ بوڑھا جانور بچارا اب تقریباً بیت چکا تھا اور اُس کی ٹانگیں گھٹنوں اور ٹخنوں کے نزدیک اس قدر سوج رہی تھیں کہ اُس کے لئے ہلنا بھی دو بھر ہو گیا تھا۔ اس کا کوٹ جیسے مدت سے کسی سائیس نے کبھی برش کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی اس کے پہلوؤں پر سفید بالوں کے گچھے کی طرح لٹک رہا تھا، اور چابک کی چند ضربوں سے غم و حرماں کا بے پناہ احساس اُس کی آنکھوں میں جھلکنے لگتا تھا۔

جب زیڈور لسے کھول کر چراگاہ میں سے جانا چاہتا تو یہ اس قدر آہستہ چلتا کہ لڑکا اس کو اگاڑی سے پکڑ کر زور زور سے کھینچتا اور اُسے اپنی پوری قوت کے ساتھ گھسیٹتے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا، چلاتا اور گالیاں دیتا تھا اور اپنے اس فرض کو بے مصرف محسوس کر کے نہایت قہر آلود نگاہوں سے اس بوڑھے لنگڑے دل جانور کی طرف دیکھتا تھا۔

کھیت میں کام کرنے والے باقی نوکروں نے جلد ہی لڑکے کے اس تنفر کو محسوس کر لیا جو اُس کے دل میں کوکو کے لئے تھا۔ اور وہ اسے دق کرنے اور اپنا دل بہلانے کے لئے ہر وقت اس سے اُس کے گھوڑے کا ذکر کرنے لگے۔ اس کے ہم عمر بھی اسے ہمیشہ دق کرتے چنانچہ وہ گاؤں میں "کوکو زیڈور" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

لڑکے کا غم و غصہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور وہ اس جانور سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ وہ ایک دبلا پتلا لمبی لمبی ٹانگوں والا غلیظ لڑکا تھا اور اس کے سخت اور موٹے موٹے سرخ بال اس کے سر پر ہمیشہ کھڑے رہتے تھے اُس کی ذہنی حالت بظاہر نہایت کمزور معلوم ہوتی تھی اور باتیں کرتے وقت وہ اس طرح لڑکھڑاتا اور رکتا تھا جیسے خیالات اُس کے بھاری اور وحشی دماغ میں کوئی شکل و صورت اختیار نہیں کر سکتے۔

یہ بات اُس کی سمجھ میں کبھی نہ آئی تھی کہ اُس کی مالکہ کوکو کو ابھی تک کیوں پال رہی ہے۔ اس کا دل اس خیال سے بہت کڑھتا تھا کہ اس مریل گھوڑے کو ناحق اچھا چارہ دے کر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ یہ اُس کے نزدیک سب سے بڑی بے انصافی تھی کہ اس مفلوک الحال جانور کو جونہی یہ کام سے فارغ ہو فوراً چارہ دے دیا جائے اور وہ اسے سخت بے وقوفی خیال کرتا تھا کہ اچھے اچھے جو اس پر ضائع کئے جائیں ―― اس بوڑھے مفلوج گھوڑے پر ―― حالانکہ جو کافی مہنگے بھی تھے بعض اوقات تو مس کے سخت احکام کے باوجود بھی وہ اس کے مقررہ چارہ میں کمی کر دیتا۔ اور اُسے پہلے سے نصف دن میں جو دیتا۔ اسی طرح اُس نے بھوسے اور خشک گھاس کی خوراک بھی کم کر دی۔ اور اُس کی طفلانہ روح اس غریب جانور کے ساتھ بے انتہا نفرت رکھنے کی وجہ سے

ؔ گھوڑے کا نام ہے

وقت بے قرار رہنے لگی --- اُس کی حریص، مکار، وحشی، بزدل اور ناپاک روح!

. . . .

موسم گرما آگیا اور اُسے پھر دن میں چار مرتبہ جانور کی جگہ بدلنے کے لئے چراگاہ کی طرف جانا پڑا۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ وہ بھاری بھاری قدم گھسیٹتا ہوا چراگاہ کی طرف جاتا تھا اور اس معمول سے اس کا قہر وغضب روز بروز زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ کھیتی باڑی کرنے والے کسان اُس کے پیچھے آواز سے کستے تھے "دیکھنا بھئی زبڈور! کوکو ہمارا بھی سلام کہہ دینا" وہ اس کا کچھ جواب نہ دیتا تھا۔

اُس نے ایک جھاڑی میں چابک چھپا رکھی تھی۔ جب وہ اسے ایک جگہ سے کھول کر دوسری جگہ باندھ دیتا اور جانور گھاس چرنے میں مشغول ہو جاتا تو وہ نہایت چالاکی کے ساتھ دبے پاؤں جانور کے پیچھے سے ہو کر نکلتا اور نہایت بے رحمی سے اُس کی رانوں اور پہلوؤں پر زور زور سے چابکوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتا۔ جانور بیچارا دولتیاں چلاتا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا وہ چابک کی ضربوں سے بچنے کے لئے رسی کے سرے پر میخ کے اردگرد سرکس کے گھوڑے کی طرح چکر کاٹتا تھا اور لڑکا دیوانوں کی طرح اُسے مارتا اور دانت پیستا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے بھاگتا تھا۔

پھر وہ چپکے سے بغیر پیچھے مڑ کر دیکھنے کے آہستہ آہستہ واپس چلا جاتا اور گھوڑا اپنے سوجے ہوئے پہلوؤں اور کانپتے ہوئے نتھنوں کے ساتھ اپنی بوڑھی اور ضعیف آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا اور اپنا سفید بالوں اور کمزور ہڈیوں والا سر اُس وقت تک دوبارہ زمین کی طرف نہ لاتا جب تک کہ دور فاصلہ پر لڑکے کا نیلا چغہ اُس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔

اب راتیں کافی گرم ہونے لگی تھیں اس لئے کوکو جنگل کے پیچھے ندی کے کنارے سونے کی اجازت مل گئی تھی اور صرف زبڈور ہی وہ شخص تھا جو اسے دیکھنے کے لئے وہاں جاتا تھا۔ وہ ایک پہاڑی کے ڈھلوان پر اس سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھ جاتا اور آدھ آدھ گھنٹہ تک بیٹھا اُس کی طرف دیکھتا رہتا اور وقتاً فوقتاً ایک نوکدار پتھر اس کی طرف پھینک دیتا۔ غریب کوکو سر اُٹھا کر متواتر اپنے دشمن کی طرف دیکھتا رہتا تھا اور اُس کی سوانگی تک اُسے سرنیچا کر کے چرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ایک خیال ہر وقت اس چھوکرے کے سر میں چکر کھاتا رہتا تھا "اب اس جانور کی پرورش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب کہ یہ کوئی کام نہیں کرتا" وہ سمجھتا تھا کہ جانور نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنی اس بری نیت پر تلا ہوا ہے کہ وہ اس خوراک کو بے رحمی کے ساتھ تلف کرتا چلا جائے جس کے حقیقی حقدار دوسرے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان اور خود خدا کے لئے دنیا میں کچھ بھی باقی نہ رہے --- ہاں! خود اس زبڈور کے لئے بھی کچھ باقی نہ رہے جسے اپنی روزی کمانے کے لئے سال میں تین سو پینسٹھ دن کام کرنا پڑتا ہے

چنانچہ رسی کی طوالت کو گھٹاتے گھٹاتے وہ آہستہ آہستہ چراگاہ میں کوکو کے حصے کی تازہ گھاس کا رقبہ کم کرتا گیا۔

جانور کمزور اور نحیف ہوتا گیا اور روز بروز موت کی طرف جھکتا چلا گیا۔

رسی توڑنے کے لئے اُس کی جسمانی کمزوری کسی طرح بھی اُس کی مدد نہیں کرسکتی تھی۔ اگلی ٹانگوں پر جھک کر وہ سرسبز گھاس کی طرف گردن لمبی کر کے منہ بڑھاتا تھا ۔۔۔ اس گھاس کی طرف جو اُس کے بالکل قریب تھی، جسے وہ سونگھ تو سکتا تھا مگر چوم نہ سکتا تھا۔

ایک صبح زیڈور کو نیا خیال سوجھا اور وہ یہ کہ کوکو کی جگہ بالکل تبدیل نہ کی جائے کیونکہ وہ اس مریل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے معمول سے بہت تنگ آچکا تھا۔

اس روز زیڈور اپنے انتقام کے نظارے سے حظ اٹھانے کے لئے وہاں آیا۔ کوکو نے اس کی طرف ملتجیانہ انداز سے دیکھا۔ زیڈور بجائے اُسے پیٹنے کے دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر اُس کے اردگرد ٹہلتا رہا۔ اُس نے گھوڑے کو وہاں سے کھول کر سرسبز گھاس والی جگہ پر باندھنے کے لئے بظاہر حرکت بھی کی مگر اُس نے اس میخ کو جس کے ساتھ جانور بندھا ہوا تھا ایک دو ٹھوکروں سے اور مضبوطی کے ساتھ زمین میں گاڑ دیا اور اپنی نئی تجویز پر مسرور ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

لڑکے کو جاتے دیکھ کر گھوڑا اُس کو واپس بلانے کے لئے ملتجیانہ انداز میں ہنہنایا مگر شریر لڑکا سے چراگاہ میں گھاس کی ننھیوں سے وہ مضبوطی سے بندھا ہوا تنہا چھوڑ کر بھاگ گیا۔

جانور بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر گھاس تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا جو اُس کے نتھنوں کو چھو رہی تھی۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک گیا اور گردن کو آگے کی طرف پھیلا کر اپنے موٹے کف آلود ہونٹوں کو حرکت دیتا رہا مگر بےکار۔ اس کا جسم سارے دن کی ہولناک اور بے سود جد و جہد سے تھک کر چور ہو گیا۔ اور وہ بھوک جو اُسے رفتہ رفتہ نگلے جا رہی تھی اردگرد کی سرسبز گھاس کے قطعوں کے نظارے سے خوفناک طریقہ پر بڑھتی گئی۔

لڑکا اس روز پھر نہ آیا وہ دن بھر جنگل میں پرندوں کے گھونسلوں کی تلاش میں پھرتا رہا۔ دوسرے دن جب وہ آیا تو اُس نے دیکھا کہ کوکو نڈھال ہو کر زمین پر پڑا ہوا ہے کوکو نے اسے دیکھا تو جگہ کی تبدیلی کی امید کر کے بصد مشکل اپنے ناتواں جسم کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔

زیڈور نے اس کی میخ کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اِدھر اُدھر پھرا، جانور کی طرف دیکھا اور مٹھی بھر کیچڑ اُس کی ناک کی طرف پھینکی جس سے اُس کے سفید چمڑے پر سیاہ چھینٹوں کے نشان پڑ گئے۔ اس کے بعد وہ سیٹی بجاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

کوکو اس وقت تک کھڑا رہا جب تک لڑکا اُس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا اور پھر یہ محسوس کر کے کہ گھاس تک پہنچنے کی تمام مساعی بے سود ثابت ہوں گی۔ اپنے پہلو پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے دن زیڈور بالکل نہ آیا۔

جب نیلڈو رایک دن بعد آیا تو اُس نے دیکھا کہ کوکو بدستور زمین پر پڑا ہے اور اُس نے محسوس کیا کہ جانور اب قطعی طور پر حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا۔

وہ وہاں دیر تک کھڑا رہا اور نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی ساری کارروائی کو دیکھتا رہا مگر اُسے کسی قدر حیرت ضرور تھی کہ یہ سب کچھ اس قدر جلدی کیونکر ختم ہو گیا۔ اُس نے نعش کو اپنے پاؤں سے چھوا، اُس کی ایک ٹانگ اوپر کو اٹھائی اور پھر نیچے گرا دی، اُس کے پہلو پر بیٹھ گیا اور دیر تک زمین میں آنکھیں گاڑ کر دیکھتا رہا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کے دماغ میں کوئی خیال تھا یا وہ کسی بات پر غور کر رہا تھا۔

جب وہ واپس کھیتی میں پہنچا تو اُس نے اس واقعہ کی اطلاع کسی کو نہ دی کیونکہ وہ گھوڑے کو ایک قطعہ سے کھول کر دوسرے قطعہ میں باندھنے کے وقت کو پرندوں کے گھونسلوں کی تلاش میں صرف کرنا چاہتا تھا۔

وہ مظلوم کوکو کو دیکھنے کے لئے دوسرے دن پھر گیا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو چند کوے اُس کے جسم پر سے اُڑے۔ اُس کے مردہ جسم کے ارد گرد کی مختصر سی فضا مکھیوں کی ناخوشگوار بھنبھناہٹ سے بھری ہوئی تھی۔

اُس نے اس خبر کا اعلان کر دیا۔ گھوڑا اس قدر بوڑھا تھا کہ اُس کی موت کسی کے لئے باعثِ حیرت نہ ہوئی لوکس نے دو مزدوروں کو حکم دیا

"اپنے پھاوڑے اور کدالیں لے جاؤ اور جہاں کوکو پڑا ہے وہاں ایک گڑھا کھود دو"

اور لوگوں نے کوکو کو اسی جگہ دفن کر دیا جہاں اُس نے بھوک سے بے تاب ہو کر جان دی تھی۔

زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ وہاں سے سرسبز گھاس کی چند خوشنما پتیاں پھوٹ نکلیں۔

(ترجمہ) عزیز

تجلّیات

یہ خواب ہے کہ حقیقت، نہ ہو سکا معلوم!
رہی یہ بات کہ "کچھ ہے" سو وہ بھی کیا معلوم!

شبِ سیاہ ہے طوفانِ باد و باراں ہے
نہ راہبر ہے، نہ ہمدم، نہ راستا معلوم

وہ مسکرا دیئے سُن کر فسانۂ غمِ ہجر
جو میری جان پہ گزری، کسی کو کیا معلوم!

یہ داستانِ وفا چھیڑنے سے کیا حاصل
نہ ڈال مجھ پہ یہ افسوں تری وفا معلوم!

اثرؔ فسانۂ ہستی بھی کیا فسانہ ہے!
کچھ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اثرؔ صہبائی

"لہو پکارے گا آستیں کا"

بہت کم ایسے خون کئے گئے ہونگے جن کے قاتلوں کا پتہ نہ لگ گیا ہو۔ کیونکہ خونی کا جرم کسی نہ کسی طرح سے ظاہر ضرور ہو جاتا ہے اور بعض موقعوں پر خود خون کرنے والا اپنی زندگی سے تنگ آ کر اپنے جرم کا گواہ بن جاتا ہے۔ اس کی گفتگو اس کی بھیانک نظر اور اس کی وحشت سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ اُس نے خون کیا ہے۔

یہی سبب ہے کہ قتل و خون کے مقدمات میں عدالت مجرم کی صورت سے بہت کچھ معلومات حاصل کر لیتی ہے اور واردات قتل کی تفتیش میں پولیس کو اتنی کاوش نہیں کرنا پڑتی جتنی چوری اور ڈاکے وغیرہ سے متعلق مقدمات میں، کیونکہ قتل کے بعد قاتل کی حالت انسان کی سی نہیں رہتی۔ وہ دیوانہ وار اپنے سائے سے ڈرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ابھی عرصہ نہیں ہوا کہ ایک خونی کو پولیس نے واردات کے بعد لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا۔ وہ سڑک پر آ رہا تھا مگر بالکل اس طرح جیسے کوئی شراب کے نشے میں ہو کبھی سڑک کی داہنی طرف چلتا کبھی بائیں طرف اور کبھی ٹھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ اسی طرح ایک خونی خون کرنے کے بعد لوگوں سے پوچھنے لگا کہ "میں نے فلاں فلاں شخص کو مار ڈالا ہے۔ اب میں کیا کروں" لوگوں نے اُسے تھانے کا راستہ بتا دیا۔ اور یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ خونی خون کرنے کے بعد سیدھا تھانے چلا گیا اور وہاں سب صاف صاف بیان کر دیا۔

غرض قتل کرنے کے بعد عموماً ہی قاتل کچھ ایسا بدحواس ہو جاتا ہے کہ اسے خود اپنی زندگی وبال ہو جاتی ہے بشرطیکہ پیشہ ور خونی قزاق نہ ہو۔ کیونکہ ایسا قاتل خونی کے نزدیک تو کسی کو مار ڈالنا کوئی بڑی بات نہیں۔

انہیں مندرجہ بالا کیفیتوں کو مدنظر رکھ کر ایک انگریزی شاعر نے مشہور مثل "Murder will out." کی تصویر لٹریچر کے ذریعے سے نہایت ہی پُر رعب پیرائے میں بیان کر کے کھینچی ہے۔ اس عبارت کے پڑھنے سے پڑھنے والے کے دل پر بھی کسی قدر خوف ساطاری ہو جاتا ہے۔ اس میں شاعر نے دکھایا ہے کہ خونی کیوں خود بخود اقبال جرم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس سے مصوری، لٹریچر اور خفیہ پولیس سے نسبت رکھنے والے لوگوں کو بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ کیونکہ علم النفس کی اکثر نمایاں خصوصیات پر مصوری لٹریچر اور سی آئی ڈی کے بہت سے اصول مبنی ہیں۔ اس لئے ذیل میں لفظ بلفظ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تاکہ اردو میں بھی اس دردناک اور سنسنی پیدا کرنے والی مصوری کی مثال موجود ہے

"لیوبک میں کسی سوداگر کے مکان پر ایک اجنبی شخص آیا۔ اس کا خیر مقدم نہایت اچھی طرح کیا گیا لیکن چونکہ گھر آدمیوں سے بھرا تھا اس لئے علیحدہ کمرے میں اس کے لئے انتظام کر دیا گیا۔ اس کمرے میں کوئی ایسی چیز

تھی کہ اُسے تنہائی میں متعجب کرتی۔ آخر کار اُس نے ایک تصویر کی طرف نگاہ ڈالی اور خیال خود بخود اُدھر مائل ہو گیا۔ وہ سر کی تصویر تھی لیکن اس کی ہیئت میں ایک غیر معمولی، خوفناک اور خارج از دنیا ایسی کوئی شے تھی کہ گو دیکھنے میں نما نہیں معلوم ہوتی تھی تاہم دیکھنے سے خواہ مخواہ دل پر ایک ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اگر کوئی شخص اُس تصویر کو ایک بار دیکھ لے تو اُس کی حیرت انگیزیوں پر بغیر غور کئے رہ نہیں سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اس تصویر کا خیال اس مہمان کے دماغ میں بھر گیا اور طبیعت کو گونہ بے چینی سی ہوئی۔ جب وہ سو گیا تو اُس نے بار بار اسی سر کو اپنی طرف غور کرتے ہوئے دیکھا۔ صبح کو میزبان نے اُس کی صورت سے پہچان لیا کہ شاید اچھی طرح نیند نہیں پڑی۔ جب وجہ پوچھی تو تصویر کا ذکر کیا گیا۔ صاحب خانہ کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے اور کہا کہ اچھا ہٹا دی جائے گی اور یہ کہ جب کبھی اس کمرے کا استعمال کیا جاتا تھا تو تصویر ضرور علیحدہ رکھ دی جاتی تھی مگر صرف اب کی بار جلدی میں کچھ خیال نہیں رہا۔ مزید استفسار پر میزبان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے کہ "اس میں شک نہیں تصویر ہیبت ناک ہے لیکن چونکہ وراثتہً خاندان میں چلی آ رہی ہے۔ اس لئے نہ تو اسے علیحدہ کرنے کو دل چاہتا ہے نہ خراب کرنے کو۔ اس کا قصّہ یوں ہے:-

"میرا باپ کسی کام سے نام برگ گیا تھا جب ایک قہوہ خانے میں پہنچا تو کھانا کھاتے وقت اُس نے ایک اجنبی نوجوان کو دیکھا جس کی صورت میں ایک خاص خصوصیت تھی۔ وہ اجنبی نوجوان ایک کونے میں بیٹھ گیا اور اکیلا کھانا کھانے لگا۔ اس کی صورت سے دماغ کی بے چینی عیاں تھی۔ اور کبھی کبھی وہ اپنا سر اِدھر اُدھر پھیرتا کہ گویا کچھ سُن رہا ہو۔ بعد ازاں ایک دم کانپ جاتا۔ چہرہ پیلا پڑ جاتا اور پھر کوشش کر کے کھانا کھانے لگتا۔ میرے باپ نے اس شخص کو لگاتار دو تین دن تک اسی حالت میں دیکھا اور چونکہ اس سے کسی قدر مانوس بھی ہو گیا تھا اس لئے ایک دن بے چینی کا سبب پوچھا۔ اُس اجنبی نوجوان کو میرے باپ کی گفتگو اور ہمدردی سے کچھ تسکین سی ہو گئی چنانچہ بات چیت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شخص اٹلی کا باشندہ تھا مگر بہت غریب۔ تاہم صاحب ہنر ہونے کی وجہ سے اپنا پیٹ پال لیتا تھا اور مصوری و نقاشی کر کے اپنی گزر اوقات کے لئے بہت کچھ پیدا کر لیتا تھا۔ میرے باپ اور اس نوجوان میں ملاقات بڑھتی گئی . . . . اور میرے باپ کو اپنی بے چینی پر بہت زیادہ متعجب دیکھ کر ایک دن آخر کار اُس نے اپنا قصّہ یوں بیان کیا۔

"میں شہرِ روم کا رہنے والا ہوں۔ ایک امیر آدمی کی سرپرستی میں نہایت آرام سے رہتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی بات پر تکرار ہو گئی اور آپس میں گالی گلوچ کی نوبت آ گئی۔ میرے آقا نے مجھے بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ بات بات میں اُس نے

مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ مجھ میں خودداری اور غصہ بہت ہے۔ اس لئے اُس کی اس حرکت پر مجھے بہت غصہ آیا۔ مرتبے کی وجہ سے میں اُس امیر کو برابری کی لڑائی پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا مگر چھپ کر ایک مرتبہ چپکے سے اُسے قتل کر دیا۔ گو میں اب اپنے ملک سے بھاگ کر ہام برگ آگیا ہوں۔ لیکن دل کو چین نہیں۔ قتل کے چند ہی دن بعد میں نے سڑک پر کسی کو اپنا نام لے کر پکارتے ہوئے سنا۔ جب میں نے پھر کر دیکھا تو اسی آقا کی شکل نظر آئی جو اس قدر غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اُس وقت سے مجھے کبھی سکون نصیب نہیں ہوا۔ ہر وقت، ہر جگہ، اور صحبت میں میں کتنا ہی مشغول کیوں نہ رہوں اُس آواز کو ضرور سنتا ہوں اور بغیر اِدھر اُدھر دیکھے رہ نہیں سکتا۔ اور جب میں اس طرح دیکھتا ہوں تو وہی شکل گھورتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آخر کار ایک دن یاس و بیم کی حالت میں میں نے اپنا چہرہ بالکل اس کے روبرو کر دیا اور آنکھ سے آنکھ ملا کر نہایت غور و خوض سے جب وہ شکل میری طرف گھور رہی تھی میں نے اس کی خوابی تصویر دماغ میں قائم کر لی اور پھر کاغذ پر اتار لی۔

"میں نے اس پریشانی کی حالت میں بہت وقت سے یہ دن گذارے ہیں اب میرے لئے زندگی وبال ہو گئی ہے جو ایسا بار ہے کہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا ارادہ ہے کہ کچھ خرچ جمع ہو جانے پر روم واپس جاؤں اور خود کو انصاف کے حوالے کر دوں تاکہ سُولی پر جا کر اس جرم کی تلافی ہو جائے۔"

اس کے بعد سوداگر نے مہمان سے کہا کہ اجنبی نوجوان نے مروّت اور ہمدردی کے عوض میرے باپ کو یہ تصویر مکمل کر کے دے دی۔ یہ وہی تصویر ہے جس کا اثر ابھی تک نہیں مٹا۔"

ناظرین "اُس اجنبی نوجوان" کی اس حالت کو خواہ قوتِ ایمانی کی طرف منسوب کریں خواہ ضمیر کی طاقت کہیں یہ ظاہر ہے کہ جرم اور خصوصاً خون کے جرم کا خوف اور چھپاؤ اخیال میں ایسا جم جاتا ہے کہ تصویر میں تشکیل پا کر نظر آنے لگتا ہے ایسے ہی واقعات کی بنا پر اردو زبان میں بھی ایک مثل مشہور ہے کہ "خون سر پر چڑھ کر بولے گا"۔ خواہ کتنا ہی چھپایا کیوں نہ جائے۔ بقولِ شاعر ع

"جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا"

سیّد مقبول حسین احمد پوری

محفلِ ادب

آرٹ اور لٹریچر

اپنے گھر کے اندر بیٹھ کر جب ہم خوشی سے ہنستے ہیں یا دل پر کوئی چوٹ لگنے سے روتے ہیں تو ہم یہ کبھی نہیں سوچتے نہ سوچنے کی ضرورت سمجھتے ہیں کہ اس سے زیادہ ہنسنا چاہیئے تھا یا ہماری اشکباری کم ہوئی ہے۔ لیکن جب ہمیں اپنی مسرت یا غم و افسوس دوسروں پر ظاہر کرنا مقصود ہو تو ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

جس وقت کوئی عورت اپنے بیٹے کی موت پر آہ و زاریاں کرتی ہوئی اپنے گاؤں کی گلیوں سے گزرتی ہے تو صرف اپنے بیٹے کی جدائی پر نہیں روتی۔ بلکہ وہ گاؤں والوں پر اپنی بدنصیبی کا اظہار بھی کرنا چاہتی ہے خود بخود رونا اور بات ہے دوسروں پر اپنی مصیبت ظاہر کرنا اور بات۔ بیٹے کی موت پر جس قدر رونا اقتضائے قدرت ہے۔ رنج و غم کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ رونا پڑتا ہے۔

لیکن آخرالذکر فعل کو اگر کوئی مصنوعی کہہ کر اس کی توہین کرے تو یہ بیجا ہوگا۔ کیونکہ اظہارِ افسوس بھی افسوس کا ایک جزو ہے۔ میرا بیٹا دنیا کی اک ضروری چیز ہے۔ اس کی جدائی میرے لئے دنیا کا اک بدترین سانحہ ہے لیکن اُس کی موت پر جو رنج مجھے ہوتا ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں ہوتا۔ نہ کوئی دوسرا اس رنج کو محسوس کرسکتا ہے۔ اُس کے مرجانے پر بھی دنیا کے کام اُسی طرح جاری رہتے ہیں۔ لوگ ہنستے ہیں گاتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں اور اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ ماں دنیا کی اس بے پروائی اور سنگدلی کو دیکھتی ہے تو اُسے صدمہ ہوتا ہے۔ اور وہ جسم و روح کی پوری قوت سے رو کر دنیا کو بتانا چاہتی ہے کہ میرے بیٹے کی موت دنیا کا معمولی واقعہ نہیں۔ کائنات کی ایک غیر معمولی مصیبت ہے۔

جس حد تک رنج و غم ہمارا اپنا ہے اُس حد تک ہم اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور یہ قدرتی ہے لیکن اُس احساس کو دوسروں پر ظاہر کرنا مطلوب ہوتا ہے تو ضبط کی دیواریں گرجاتی ہیں۔ اور ہماری آہ و زاریاں قدرتی حدود سے متجاوز ہو جاتی ہیں۔

ہمارے غم میں جس قدر زیادہ لوگ ہمارے ساتھ شریک ہوتے ہیں اُسی قدر اس غم کی صداقت کی تصدیق ہوتی ہے۔

ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم کسی بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں تو یہ ہماری بھاری کمزوری، بیوقوفی یا جہالت نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے دوسرے لوگوں پر بھی وہی حالت طاری ہے۔ ہمارا غم خیالی نہیں ہے حقیقی ہے۔ یہ سوچ کر ہمیں طبیعت کا قرار سا مل جاتا ہے۔

میری "تکلیف میرے قریب ہے۔ مجھے محسوس ہوتی ہے۔ وہ تمہاری تکلیف نہیں ہے۔ نہ تمہارے قریب ہے اس لئے تم اُسے محسوس نہیں کر سکتے۔ تم مجھ سے دُور ہو۔ وہ تمہیں چھوٹی نظر آتی ہے۔ اس لئے جس قدر فاصلہ میرے اور تمہارے مابین حائل ہے اُسی اندازہ سے اس تکلیف کو بڑا کر کے ظاہر کیا جائے جبھی تم اُسے اس قدر بڑا دیکھ سکو گے جس قدر کہ میں اُسے دیکھتا ہوں۔ لہذا یہاں پر افراط کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ جو چیز دوسروں کو دکھانا مقصود ہو۔ اُسے کسی قدر بڑھانا قدرتی ہے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے یہ اور بات ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جو چیز جس قدر چھوٹی ہوگی اسی قدر لوگوں کو حقیر و کم بضاعت معلوم ہوگی۔ اور اُسے پُر صداقت ثابت کرنے کے لئے بڑا کر کے دکھانا ہوگا۔

جو اصول اوپر بیان کیا گیا ہے، وہی اصول ادبی دنیا میں بھی کام کرتا ہے۔ کسی شئے یا حالت کو جیسی کہ وہ ہے اُسی طرح ہوبہو بیان کر دینے کا نام آرٹ نہیں ہے۔ آرٹ اُسے اس طریق سے بیان کر دینے کا نام ہے کہ اُس کے مطالعہ سے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر بھی وہ حالت طاری ہو جائے جو بیان کرنے والے کے دل و دماغ پر حاوی ہے۔

لیکن اس کا طریق کیا ہے؟ باہر کی دنیا میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ اور ہمارے حواس اُس کی شہادت دیتے ہیں لیکن دنیائے ادب میں جو کچھ دکھانا مقصود ہے قدرتی ہونے کے باوجود آنکھ کو نظر نہیں آتا۔ ادب اس کمی کو پورا کرتا ہے۔

دنیوی صداقت اور ادبی صداقت میں یہاں سے فرق شروع ہو جاتا ہے۔ دنیائے ادب کی خیالی ماں اس طرح نہیں روتی جس طرح وہ روتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا انتہا درجہ کی غلطی ہے کہ دنیائے ادب کی خیالی ماں کی آہ و زاریاں غیر فطرتی ہیں۔ ایک عورت جب روتی ہے، اُس کے آنسو جب گالوں پر بہتے ہیں اور دیکھنے والوں کو جب اس کا بچہ اور اُس کی دیکھی ہوئی جانی پہچانی ہوئی عہدِ طفلی کی دلکش ادائیں یاد آتی ہیں تو اُن پر رقت کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اُس عورت میں یہ طاقت نہیں، کہ وہ اپنے دل کی حالت کو لوگوں پر کامل طور سے نقش کر دے۔

لہذا لٹریچر کو بجا طور پر فطرت کا آئینہ نہیں کہا جا سکتا اور یہ صرف لٹریچر ہی کا حال نہیں کسی بھی آرٹ میں قدرت کی ہوبہو نقل و نقاشی نہیں کی جاتی۔ قدرت میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، سامنے دیکھتے ہیں اور حقیقت میں دیکھتے ہیں لٹریچر اور آرٹ جو کچھ دیکھتے ہیں کسی دوسری طرح دیکھتے ہیں۔ قدرت میں حقیقی شئے نظر آتی ہے۔ لٹریچر میں صرف سایہ دکھائی دیتا ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں لٹریچر میں شعر و شاعری اور نغمہ و نے کی امداد لینا پڑتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تصنیف کا لباس

مصنوعی ہونے کے باوجود اُس کی رُوح قدرتی صداقت سے بھی زیادہ حقیقی اور روشن و منور نظر آنے لگتی ہے

یہاں میں نے "زیادہ حقیقی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور اس کا خاص مطلب ہے۔ انسانی جذبات سے متعلق قدرتی صداقت آلودہ، شکستہ اور عارضی ہوتی ہے۔ بحرِ دنیا میں لہریں ہمیشہ اُٹھتی رہتی ہیں اور ایک دوسری سے اُلجھتی رہتی ہیں۔ قدرت کے اس وسیع سٹیج پر جب ہم جذباتِ انسانی کے ناٹک کو دیکھتے ہیں۔ تو ہم اُن کے درمیان خطوطِ امتیاز کھینچتے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق بہت کچھ فرض کر لیتے ہیں۔ کیا کوئی شخص ایسا ہے جو دعوے کے ساتھ سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکے کہ میں نے اپنے قریبی سے قریبی رشتہ دار کو بھی کامل طور پر پہچان لیا ہے۔ وہ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے دماغ نے اس کا مطالعہ بہت حد تک کر لیا ہے۔ اگر اس کے احساسات اور جذبات کا تمام تر مطالعہ کیا جائے۔ اس کی ایک ایک تفصیل کو یاد رکھا جائے تو ہم اپنے دماغ میں اس قدر مہین اور لطیف خطوط کھینچ لیں گے کہ ہمارے لئے اُس کا شناخت کرنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ اس لئے ہمارا دماغ جس خط کو مناسب سمجھتا ہے۔ یاد رکھنے کے لئے انتخاب کر لیتا ہے، باقی کو فراموش کر دیتا ہے۔ اس لئے جو کچھ ہم دیکھتے یا سمجھتے ہیں۔ وہ زیادہ حقیقی ہو سکتا ہے۔ بالکل حقیقی نہیں ہو سکتا۔

لٹریچر جس شے کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اُسے اُس کی کامل صورت میں پیش کرتا ہے۔ جو شے بڑی ہے، اسے بڑھاتا ہے، جو شے چھوٹی ہے اُسے گھٹاتا ہے، جو جگہ خالی ہے اُسے پُر کرتا ہے۔ لٹریچر دماغ کا مقلد ہے۔ دماغ فطرت کا آئینہ نہیں ہے۔ نہ لٹریچر فطرت کا آئینہ ہے۔ دماغ فطرت کی پیداوار کو دماغی رنگ دے دیتا ہے۔ اسی طرح ادب دماغ کی پیداوار کو ادبی حیثیت دے دیتا ہے اور دونوں کا طریقِ عمل یکساں ہے لیکن دونوں میں کامل یکسانیت نہیں ہے۔ دماغ جو کچھ یاد کرتا ہے اپنی ضرورت کے لئے کرتا ہے۔ لٹریچر جو کچھ بناتا ہے دوسروں کو مسرور کرنے کے لئے بناتا ہے۔ اپنے لئے مختصر یادداشت ہی کافی ہے لیکن دوسروں کے لئے یہ یادداشت قطعی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ اسے پورے طور سے پروان چڑھانا پڑتا ہے اور اس کو ایسی روشنی میں، اس طریقہ سے، ایسی جگہ رکھنا پڑتا ہے۔ کہ سب کی نظر یکساں پڑے۔ بالعموم دماغ اپنا مواد فطرت کی تصاویر سے منتخب کرتا ہے اور لٹریچر اپنا مواد دماغ کی یادداشتوں سے حاصل کرتا ہے۔ دماغ کی تصویر کو باہر لانے کے لئے لٹریچر کی ضرورت ہے اس طرح فطرت سے دماغ میں اور دماغ سے لٹریچر میں جو کچھ منتقل ہوتا ہے، وہ حقیقت سے کوسوں دور ہو جاتا ہے لیکن وہ رہتا پھر بھی حقیقی ہے۔

لٹریچر کا کام یہ ہے کہ اندر کی چیز کو باہر لے آئے۔ جذبات کو زبان میں منتقل کر دے اپنی چیز وقفِ عالم کر دے اور عارضی حالتوں کو مستقل شکل دے دے۔

"چندن"

مغلیہ ہندوستان کی ایک جھلک

دہلی کے رہنے والے ایک مغل بچہ تھے انہیں لڈو کے نام سے بڑی نفرت تھی۔ لال قلعہ کے بادشاہزادوں نے ان کا لقب میرزا لڈو بیگ رکھ دیا تھا اور میرزا لڈو بیگ کو لڈو کے نام سے چڑتے تھے مگر دو دو سیر لڈو کھا لیتے تھے، مثلاً لال قلعہ میں کسی بادشاہ زادہ کے سلام کو گئے، بادشاہزادہ صاحب نے نوکر کو اشارا کیا اُس نے سیر دو سیر لڈو لا کر دیوانخانہ کے طاق میں رکھ دیئے اور میرزا صاحب کو صاحب عالم نے حکم دیا کہ دیکھئے اُس طاق میں ایک گلدستہ رکھا ہے اُسے اُٹھا لائیے۔ میرزا صاحب طاق کے پاس پہنچے تو دیکھا طاق میں گلدستہ کے بجائے ایک طباق لڈوؤں کا بھرا رکھا ہے۔ اب کیا تھا لڈو بیگ بھر پڑے پہلے تو انہوں نے صاحب عالم کے نوکروں کو گالیاں دیں یا جی ہیں ایسے ہیں ویسے ہیں بدمعاش ہیں جس سے مجھے چڑ ہے وہی میرے سامنے لا کر رکھی ہے۔ پھر صاحب خانہ کی دھجیاں لینی شروع کیں خدا اس لال قلعہ کو اجاڑے لال قلعہ والوں نے سر سے کنواں کھود رکھا ہے نادر شاہ ایک پھیرا ایران سے دلی کا اور کرے تو مزا آئے۔ لڈو جو میرے جانی دشمن ہیں انہیں میرے لئے لگا رکھا ہے مگر میں اپنے دشمنوں کو کب سلامت چھوڑنے والا ہوں سب کو نگل جاؤں گا یہ کہا کرتے تھے اور ایک ایک لڈو کھاتے جاتے تھے اور انعام پاتے تھے۔ بادشاہزادے اُن کی بکواس سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے آخر میں جب گذارہ کی صورت دلی میں نہ دیکھی تو باہر چلے گئے تھے، ایک بڑے راجہ کے ہاں مصاحبوں میں داخل ہو گئے تھے وہاں بھی بننے لگے تھے اور لڈو بیگ کہلانے لگے تھے۔ ایک دن راجہ صاحب کے دربار میں حاضر تھے۔ راجہ صاحب نے سرِ دربار اُن کے چڑانے کے لئے لڈو کا نام لیا اور میرزا صاحب نے تلوار نکال کر راجہ صاحب پر حملہ کیا مگر کسی درباری نے اُن کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور کہا یہ بدخواہ ہے اسے دربار سے نکال دیجئے۔ مہاراجہ نے کہا لڈو بیگ کی یہ ادا مجھے بہت بھائی ایسا وضعدار آدمی وفادار بھی ہوتا ہے۔ وقت پر جاں نثاری کرتا ہے۔ میرزا لڈو بیگ کو خلعت ملا اور ساری عمر خوشی سے کٹی۔

"ساقی"

مغل مصوری

سیر و شکار کے مناظر کو پردۂ تصویر میں نمایاں کرنا مغل مصور کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ جہانگیر جب کبھی شکارگاہ میں جلوہ افروز ہوتا، چابکدست مصور اُس کے ہمرکاب ہوتے اور اُس کے کارناموں کو رنگ و روغن سے چمکا کر داد شجاعت دیتے تھے۔ جہانگیر شیر کے شکار کا بہت شائق تھا مغل مصوری کے ہر مرقع میں ایسی متعدد تصویریں ملتی ہیں جو اس حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں۔ اس نادر مجموعہ

کی ایک تصویر نہایت حیرت انگیز منظر پیش نظر کرتی ہے - شیر خوفزدہ ہاتھی کی پشت پر سوار ہے - جسے بادشاہ اپنی خالی بندوق سے روکے ہوئے ہے، متوحش مہاوت بادشاہ کو خطرہ میں چھوڑ کر ہودہ سے کود پڑا ہے - اب ناظر کو یہ معلوم کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی بے چینی محسوس ہوتی ہے کہ شیر کے جنگل سے کس طرح بادشاہ کی مخلصی ہوئی؟ مگر ذکی الفہم مصور نے یہ مشکل بھی اس طرح آسان کر دی ہے کہ ایک مسلح سوار کو شیر کے تعاقب میں جھپٹتے ہوئے نمایاں کر دیا ہے، سوار نے موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے غیر معمولی تیزی سے گھوڑا چھوڑ دیا ہے، چہرہ پر جوش وفاداری کا رنگ غالب ہے، ایک ہاتھ میں راس ہے دوسرے سے بار بار نیزہ تول رہا ہے، غرض ایک لطیف کنایہ سے مصور نے ساری داستان مکمل کر دی ہے، پھر سونے پر سہاگا یہ کہ بزدل مہاوت کی کرتوت کو اس پہلو سے واضح کیا ہے کہ تصویر میں جان پڑ جانے کے علاوہ تفریح وتفنن کا سامان بھی فراہم ہو گیا ہے، جس سے دیکھنے والے کی دماغی بے چینی سکون ومسرت سے بدل جاتی ہے۔

"زمانہ"

وہ زندہ ہیں

مجھ سے یہ نہ کہو کہ وہ مر چکے ہیں ——— وہ عالی منش گروہ، غیر فانی ابطال کی وہ آسمانی فوج - وہ اپنی قوم کے سروں پر ایک زندہ بادل کی طرح منڈلا رہے ہیں - کیا وہ مر چکے ہیں جن کی آواز اب بھی ہماری آوازوں سے بلند آ رہی ہے؟ کیا وہ مر چکے ہیں جو اب بھی مصروف کار ہیں؟ کیا وہ مر چکے ہیں جن کا اثر اب بھی معاشرہ پر قائم ہے اور جو لوگوں کے دلوں میں بلند تر مقاصد اور عالی تر قومیت کی روح پھونک رہے ہیں۔

تمام پہاڑ اسی طرح قائم رہیں گے، اور تمام دریا اسی طرح چلتے رہیں گے، اور تمام وادیاں اسی طرح لہلہاتی رہیں گی؛ اور جب تک پہاڑ ریزہ ریزہ نہ ہو جائیں، اور جب تک دریا اپنی رفتار پر قائم رہیں، اور جب تک بادل چشموں کو سیراب کرنا نہ چھوڑ دیں، اور جب تک چشمے ابلنا اور ندیاں گانا نہ بھول جائیں - قومی حافظے کی کتاب میں اُن کے نام زرّیں حروف میں چمکتے رہیں گے۔

"مائی میگزین"

نئی کتابیں

عبادت اور اُس کی غایت، مولفہ مولانا میرزا ابوالفضل صاحب۔ یہ کتاب سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے جو قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے کی گئی ہے۔ آنحضرت صلعم نے سورۂ فاتحہ کو اُمّ الکتاب کہا ہے جس کا مطلب ہے کہ قرآن مجید کی تمام تعلیمات اس میں بصورت اجمال موجود ہیں۔ اس لئے اس کو پڑھ لینا گویا ایک طرح تمام قرآن کے مطالب سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ صرف ایک خدا کی مشیت کی تکمیل کرنا ہماری عین عبادت ہے، اور اسی عبادت کی توفیق طلب کرنا ہمارا عین مذہب ہے۔ جس فلسفیانہ انداز میں یہ تفسیر لکھی گئی ہے اس کی داد کچھ اہلِ بصیرت ہی دے سکتے ہیں۔ کتاب نہایت عمدہ ٹائپ میں اعلیٰ درجے کے کاغذ پر چھپی ہے اور مجلد ہے۔ حجم ۸۳ صفحات قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ، مینجر کتابستان، ۱۷ ایلگن روڈ، الہ آباد۔

حافظِ شیراز حافظ کی نظر سے، از مولوی سید یوشع صاحب بی اے (علیگ) اس کتاب میں حافظ علیہ الرحمۃ کے کلام پر ایک جدید قسم کا تبصرہ کیا گیا ہے یعنی حافظ کے کلام کے محاسن خود حافظ کے کلام سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کام کے لئے شاعر کے کلام پر ایک زبردست عبور ہونے کی ضرورت تھی مصنف کے حسنِ انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کام کے اہل ہیں۔ انہوں نے حافظ کے کلام کا اس دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ایسے ایسے نکتے پیدا کئے ہیں کہ آدمی اُن کے ذہن کی رسائی پر حیران رہ جاتا ہے۔ حجم ۵۷ صفحات قیمت آٹھ آنے۔ مکتبۂ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد، دکن سے طلب فرمائیے۔

تذکرۂ ریختی۔ مرتبہ جناب مولوی سید تمکین صاحب کاظمی منشی فاضل، ایم آر اے ایس۔ یہ کتاب ۴۳ ریختی گو شعرا کے مختصر حالات اور انتخابِ کلام پر مشتمل ہے۔ ریختی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ریختے کی تانیث ہے۔ ریختے میں مردوں کی زبان ہوتی ہے ریختی میں عورتوں کی۔ فرق اتنا ہے کہ ریختے میں عموماً پاکیزہ اور مہذب خیالات کی ترجمانی کی جاتی ہے لیکن ریختی میں غیر مہذب اور لبسا اوقات فحش خیالات بیان ہوتے ہیں۔ اگرچہ لکھنے والے ریختی کے بھی مرد ہیں لیکن یہ اُس زمانے کی ایجاد ہے جب ہندوستان کے ”مرد بھی زن“ ہوچکے تھے۔ ریختی میں اُس دور کی بگڑی ہوئی معاشرت کا نقشہ ہے جب لکھنؤ کے رؤسا و امرا میں عیش و عشرت کا بازار گرم تھا۔ اگرچہ یہ صنفِ ادب مخربِ اخلاق ہونے کی وجہ سے زیادہ ترقی نہ کرسکی لیکن اس میں عورتوں کے جذبات اور زبان اس خوبی سے ادا ہوئے ہیں کہ فطرتِ نسوانی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ سید صاحب نے اس کتاب کو "علم برادرانِ شرم وحیا" سے ڈرتے ڈرتے شائع کیا ہے لیکن ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے اس کی اشاعت سے ایک قومی سرمایہ کو محفوظ و منظم کردیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مبسوط اور مفید مقدمہ ہے اور آخر میں مشکل الفاظ اور محاورات کی فرہنگ ہے، اشعار کا انتخاب نہایت موزوں ہے۔ حجم ایک سو صفحات سے زائد قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ، مکتبۂ ابراہیمیہ۔ اسٹیشن روڈ، حیدرآباد، دکن۔

اولاد نہیں ہوتی تھی

مگر اب دنیا میں کوئی بھی اولاد سے محروم نہیں رہیگا

زنانہ دواخانہ کی حیرت انگیز ایجاد

خدا کا شکر ہے کہ زنانہ دواخانہ دہلی کی خاص ایجاد سفوف محافظ اولاد کی تلاش اور تیاری میں کارکنان دواخانہ نے جو محنت اور جاں فشانی کی اور خرچ کیا اس میں حیرت انگیز کامیابی ہوگئی اور اب تو ہفتہ میں کئی کئی اطلاعیں کامیابی کی آرہی ہیں اگر کوئی بہن اب بھی اولاد سے محروم ہو تو وہ فوراً سفوف محافظ اولاد کی ایک شیشی منگا کر استعمال کرلے اور خدا کی قدرت اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ دواؤں میں بھی اللہ تعالے نے کیسی کچھ تاثیر رکھی ہے ایک بہن کے لئے صرف سات روز استعمال کے لائق ایک شیشی منگانی چاہیئے اب تک دو سو عورتوں سے زیادہ نے کامیابی کی اطلاع دی ہے اور خدا جانے کتنی ایسی ہونگی جنھوں نے ابھی اطلاع نہیں بھیجی کئی بہنوں نے خود اپنے خرچ سے اخباروں میں اس کی تعریف شائع کرادی غرض اب ہمیں اس کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے استعمال کرنے والی عورتیں خود جگہ جگہ اس کی تعریف کرتی ہیں۔ قیمت فی شیشی عہ (محصول ڈاک ۵/)

ملنے کا پتہ۔ زنانہ دواخانہ دہلی

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے +

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اتریں درج کئے جاتے ہیں +

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے +

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے +

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے +

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے +

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا +

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے +

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر +

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے +

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے +

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور



محمد عبداللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا